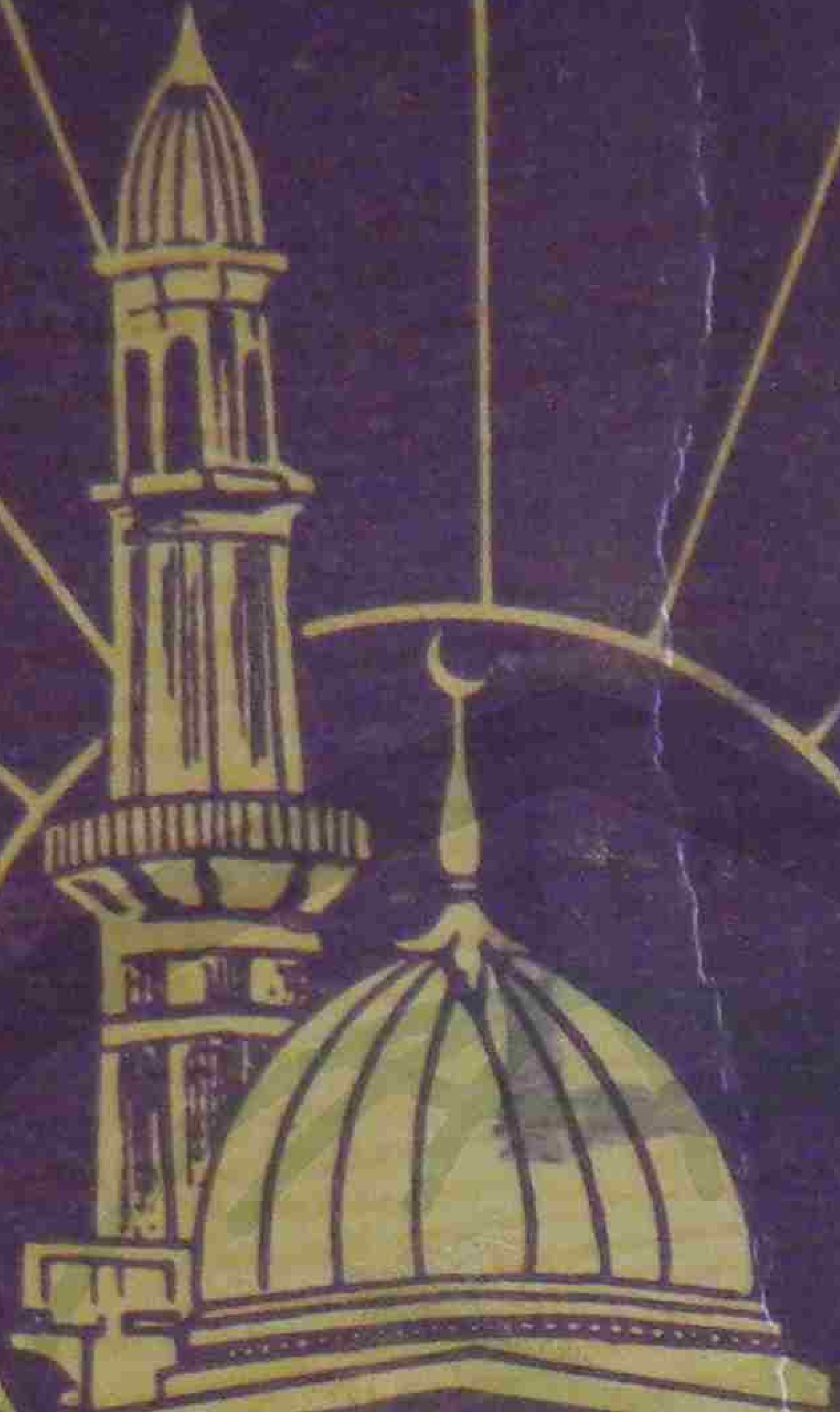


دین آباءِ النبیؐ

صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم

جس میں

یہ بتلایا گیا ہے کہ پیغمبرِ اسلام کے آباؤ اجداد وامہات وجدات سب دینِ حق پر تھے

مُصنّفہ

سید حشمت حسین جعفری ایڈووکیٹ

بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (علیگ) حیدرآباد (سندھ)

مکتبہ افکارِ اسلامی گاڑی کھاتہ حیدرآباد

۷۸۶

قال النبی ص لم یزل اللّٰہ ینقلنی من اصلاب الطاہرین الی ارحام الطاہرات (حدیث)
نبی نے فرمایا: اللہ ہمیشہ مجھے پاکیزہ لوگوں کے صلب سے پاکیزہ عورتوں کے رحم میں منتقل کرتا رہا

دین آباء النبی صلے اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم

جسمیں

یہ بتلایا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم کے آباء و اجداد و امہات و جدات سب دین حق پر تھے

مصنفہ

سید حشمت حسین جعفری ایڈوکیٹ

بی اے۔ ایل ایل۔ بی (علیگ) حیدر آباد سندھ

مصنف کتاب

آئینۂ حقائق، شہاب ثاقب، عصمت رسول، شیعہ محمد

مکتبۂ افکار اسلامی گاڑی کھاتہ حیدر آباد (پاک)

ناشر مکتبۂ افکار اسلامی حیدر آباد

طابع سعید آرٹ پریس حیدرآباد

کتابت محمد شمس الرحمٰن خاں (علیگ)

تعداد ایک ہزار

طبع اول ۱۹۶۷ء

قیمت ۲ ر روپیہ ۵۰ پیسہ

ملنے کا پتہ

مہتمم مکتبۂ افکار اسلامی گاڑھی کھاتہ حیدر آباد

نذرِ عقیدت

بہ بارگاہ حضرت ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام

میں اپنی اس حقیر لیکن پُر خلوص سعی و کاوش کو کتابی شکل میں بطور نذر عقیدت بہ صد ادب جناب سرور کائنات، سر دفتر موجودات حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ علیہ الاف التحیات والثنا کی بارگاہ میں پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔

ع۔ گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف

احقر الکونین

سیّد حشمت حسین جعفری

حیدر آباد سندھ

نوٹ

فہرستِ مطالب کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سببِ تالیف

علمائے متقدمین سوادِ اعظم کا یہ نظریہ تھا کہ آنحضرت ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والدین حضرت عبداللہ اور حضرت آمنہ اور آپ کے جدّ امجد حضرت عبدالمطلب نے بہ حالت کفر و شرک انتقال کیا اور اُن کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ یہ نظریہ صریح طور سے اُس مشہور حدیث کے خلاف ہے جس میں آپ نے غیر مبہم الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے: "لم یزل اللّٰہ ینقلنی من اصلاب الطاھرین الی ارحام الطاھرات" یعنی اللہ جلّ شانہٗ ہمیشہ مجھے طاہر مردوں کے صلب سے طاہرہ عورتوں کے رحموں میں منتقل کرتا رہا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ "انّما المشرکون نجس" یعنی مشرک نجس ہوتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ آپ کے تمام آباء و اجداد اور اُمہات و جدّات شائبۂ کفر و شرک سے مبرّا تھے۔

اب غور طلب چیز یہ ہے کہ آپ کے والدین اور جدّ امجد کے متعلق یہ نظریہ کس طرح قائم ہوا تاریخ اسلام کے طالب علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ اسلام ایک ایسے دور سے بھی گزرا ہے کہ جب یہود و نصاریٰ میں سے

کچھ لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ ان میں سے دو شخصیتیں قابل ذکر ہیں، ایک کعب الاحبار اور دوسرے وہب ابن منبہؒ۔ کعب الاحبار علمائے یہود سے تھا اور یمنی الاصل تھا۔ اس نے حضرت ابوبکرؓ اور بقولے حضرت عمرؓ کی زمانۂ خلافت میں اسلام قبول کیا۔ وھب بن منبہ بھی ایک جیّد عالم یہود تھا اور یمن نژاد تھا۔ اس نے سنہ ۱۱۰ ہجری میں بہ مقام صنعا وفات پائی۔ تفاسیر میں جو اسرائیلیات پائی جاتی ہیں اُن کے موجد یہی دو شخص ہیں۔ (فجر الاسلام عربی للدکتور احمد امین مصری، ص ۱۶۰)

یہ ایک حقیقت ہے کہ علمائے یہود کی اکثریت نے حضرت عیسیٰ کو نبی اور اُن کی لائی ہوئی کتاب، انجیل، کو منزل من اللہ نہیں تسلیم کیا اسی طرح اُنھوں نے پیغمبر اسلام کو نبی برحق اور اُن کی لائی ہوئی کتاب "قرآن" کو منزّل من اللہ نہیں مانا۔ علمائے نصاریٰ کی اکثریت نے بھی آنحضرت ختمی مرتبت علیہ السلام کو نبی برحق اور اُن پر نازل شدہ کتاب کو کلام خدا قبول نہیں کیا۔ گویا پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تکذیب اور توہین میں علمائے یہود و نصاریٰ دونوں مشترک تھے۔

بے شک ان دونوں علمائے یہود و نصاریٰ نے اسلام قبول کیا لیکن اسلام دشمنی کی آگ جو کسی وقت ان کے سینوں میں شعلہ زن تھی وہ دب تو گئی لیکن بالکل سرد نہیں ہوئی۔ اسی اندیشہ کے پیش نظر اصحاب رسول مقبول ابتدا میں ان کے ساتھ خلا ملا نہیں ہوئے۔ لیکن حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں کعب الاحبار نے اُن کے پاس اپنی آمد و رفت

پڑھائی اور بعض اوقات وہ اس کے بیان کردہ واقعات کو سننے لگے جس سے عام صحابہ نے اُس کی باتوں کو سننے کی اجازت پر محمول کیا اور اس کے بیان کردہ واقعات جو بیشتر اسرائیلیات پر مشتمل ہیں نقل اور منتشر ہونے لگے۔ علامہ ابن کثیر اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"إنه لما أسلم في الدولة العمرية، جعل يحدث عمر رضي الله عنه عن كتبه قديماً فربما استمع له عمر رضي الله عنه فترخص الناس في استماع ما عنده، ونقلوا ما عنده عنه غثها وسمينها"

(تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص ۱۷)

جب کعب بن الاحبار نے حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں اسلام قبول کیا تو وہ اُن سے یہودیوں کی کتب قدیم کے تذکرے بیان کرنے لگا۔ ایسے بھی مواقع ہوتے تھے جب حضرت عمرؓ اس کے بیان کردہ تذکروں کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے اس کو لوگوں نے کعب کے بیان کردہ واقعات کی طرف توجہ دینے کی رخصت و اجازت کے مرادف سمجھا اور وہ اُس کے بیان کردہ واقعات کو اُن کے مضرت خیز نتائج اور سمیت ریز عواقب سے بے پروا ہو کر اُس کے حوالے سے نقل کرنے لگے۔

ہم نے اوپر تحریر کیا ہے کہ گو کعب الاحبار اور وہب ابن منبہ نے اسلام قبول کر لیا مگر اسلام دشمنی کا عنصر ان کی ذہنیت میں باقی رہا۔

اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ اسلام میں ذبیح اللہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں اور یہودیوں اور نصرانیوں کے نزدیک حضرت اسحٰق ہیں۔ کعب الاحبار نے اسلام لانے کے بعد اس عقیدہ کی مسلمانوں میں نشر و اشاعت کی کہ ذبیح اللہ حضرت اسحٰق علیہ السلام ہیں تاکہ پیغمبر اسلام کو اولاد ذبیح اللہ ہونے کا شرف حاصل نہ ہو سکے۔ اس کے متعلق جس قدر روایات وارد ہوئی ہیں اُن کے متعلق علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:۔

"وھٰذہ الاقوال کلھا ماخوذۃ عن کعب الاحبار"	یہ تمام اقوال کعب الاحبار سے اخذ کیئے گئے ہیں۔

اس کے بعد موصوف تحریر کرتے ہیں:۔

ولیس لھٰذہ الامۃ حاجۃ الی حرف واحد مما عندہ (تفسیر ابن کثیر جلد ۴، ص ۱۷)	اور اس اُمت کو اُن واقعات میں سے جو کعب الاحبار نے بیان کئے ہیں کسی ایک حرف کے قبول کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

بدقسمتی یہ ہوئی کہ خیر الامت حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کعب الاحبار کی صحبت میں زیادہ بیٹھے اور ان ہی دونوں بزرگوں نے اُس کے بیان کردہ واقعات کی نشر و اشاعت کی۔ چونکہ اسلام میں ان دونوں کا علمی مقام اچھا خاصا بلند ہے اس لئے اسرائیلیات کتب تفاسیر و احادیث میں داخل ہو گئیں۔ چنانچہ ڈاکٹر احمد امین مصری اپنی کتاب فجر الاسلام میں لکھتے ہیں:۔

"وقد اخذ عنه اثنان، هما اكبر من نشر علمه: ابن عباس۔ وهذا يعلل ما في تفسيره من الاسرائيلات۔ وابوهريرة" (فجر الاسلام ص ۱۶۰)

کعب الاحبار سے دو شخصوں نے علم اخذ کیا اور اُس کے علم کی نشر و اشاعت بھی ان ہی دونوں کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ ایک حضرت ابن عباسؓ جن کی تفسیر اسرائیلات سے بھری ہوئی ہے اور دوسرے ابوہریرہؓ۔

یہ ہی کعب الاحبار ہیں جنہوں نے اس روایت کو بیان کیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین مشرک اور جہنمی تھے۔ چنانچہ مُلّا معین کاشفی اپنی کتاب معارج النبوۃ میں لکھتے ہیں۔

"وروایت کعب الاحبار چنان است کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمود: لیت شعری ما فعل اللہ بوالدیّ، کاشکے بدانستمی کہ اللہ با مادر و پدر من چہ کرد، حق تعالیٰ این آیت فرستاد انّا ارسلناک بالحق بشیراً و نذیراً ولا تسئل عن اصحاب الجحیم (سورہ بقرہ آیت ۱۱۹)

کعب الاحبار کی روایت اس طرح ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: کاش مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے میرے ماں باپ کے ساتھ کیا کیا۔ اس پر حق تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اے پیغمبر! ہم نے تم کو خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور تم سے اہل دوزخ کے بارے میں کوئی بازپرس نہ ہوگی (سورۂ بقرہ آیت ۱۱۹)

راوی می گوید کہ بعد از نزول این آیت ہرگز نشنودیم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یاد پدر و مادر کردہ باشد" (معارج النبوۃ رکن دوم، ص ۷۵)

راوی کہتا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پھر کبھی نہیں سنا کہ انھوں نے اپنے باپ یا ماں کو یاد کیا ہو۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کعب الاحبار کے علم کو نشر کرنے والے حضرت ابن عباسؓ اور ابوہریرہؓ ہیں۔ چنانچہ حضرت ابن عباس سے بھی یہ ہی روایت منقول ہے۔ علامہ ابن کثیر آیہ ولا تسئل عن اصحاب الجحیم کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

"وحکاہ القرطبی عن ابن عباس ومحمد بن کعب" (تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۱۶۲)

یعنی یہ ہی روایت امام قرطبی نے حضرت ابن عباسؓ اور محمد بن کعب سے نقل کی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ پر افترا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آیۂ مذکورۃ الصدر کی یہ شان نزول اس مفروضہ کے تحت بیان کی گئی ہے کہ آیۂ کریمہ "وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ" میں لا تسئل کی قرأت لَا تَسْئَلْ یعنی نہی ہے اور قرأہ متواترہ میں یہ فعل مجہول ہے حضرت ابن عباس کا یہ فعل نہیں ہو سکتا کہ وہ قرأت متواترہ سے انحراف کریں۔ یہ فعل تو کعب الاحبار جیسے لوگوں کا ہی ہو سکتا ہے جو اسلام دشمنی کو اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہوں۔

سوء اتفاق کہ عہد بنی عباس میں سیاسی ضرورت کی بنا پر اس

شانِ نزول سے کام لینا پڑ گیا اور سرکاری سطح پر اس نظریہ کی نشر و اشاعت ہوئی۔ اس اجمال کی تفصیل اس طرح ہے کہ یہ چیز تو تاریخ داں حضرات پر روشن ہے کہ بنو عباس نے بنو فاطمہ کو مستحق خلافت ظاہر کر کے بنو امیہ کے خلاف خروج کیا تھا اور اُن ہی کے اثرات کی وجہ سے اُنہیں کامیابی ہوئی تھی لیکن کامیاب ہونے پر خلافت پر خود قبضہ کر لیا۔ خاندان بنو عباس کے دوسرے تاجدار منصور دوانیقی کے زمانہ میں جب اولاد امام حسن پر بے انتہا مظالم ہوئے تو محمد نفس زکیہ نے جو امام حسنؑ کے پوتے تھے، منصور کے خلاف خروج کیا۔ جب محمد نفس زکیہ کی تحریک نے زور پکڑا تو منصور نے ازراہ فریب اُن کو ایک خط لکھا جس میں اُنہیں امان دینے کا وعدہ کیا۔ محمد نفس زکیہ نے اس کے جواب میں منصور کو خط لکھا اور اس میں اپنی فضیلتیں بیان کیں۔ "منجملہ دیگر فضیلتوں کے ایک فضیلت یہ بھی بیان کی:۔

"ہم جاہلیت میں اُن کی دادی فاطمہ بنت عمرو (زوجہ عبد المطلب) کی اولاد ہیں اور عہد اسلام میں اُن کی صاحبزادی فاطمہ کی اولاد ہیں۔" (اردو ترجمہ تاریخ طبری، جلد سوم، حصہ اول، ص ۱۹۳)

اس کے جواب میں منصور نے اپنے خط میں تحریر کیا:۔

"اگر اللہ عورتوں کے حق اُن کی قرابت کی وجہ سے قائم کرتا تو سب سے زیادہ حق اور مرتبہ اس دُنیا میں، اور آخرت میں دخول جنت کا شرف اولیت رسول اللہ صلعم کی والدہ آمنہ کو عطا فرماتا لیکن اللہ

نے اپنے علم کے باوجود یہ شرف دوسروں کو دیا"
آگے چل کر اسی خط میں تحریر کیا۔

"تم نے ابی طالب کی ماں فاطمہ (بنت عمرو) کا ذکر کیا ہے اور اُن کی اولاد ہونے پر فخر کرتے ہو حالانکہ اس کی اولاد میں سے چاہے بیٹا ہو یا بیٹی کسی کو اسلام لانے کا شرف نصیب نہیں ہوا" (اُردو ترجمہ تاریخ طبری، جلد سوم، حصہ اوّل، ص ۱۹۳)۔

چونکہ محمد نفس زکیہ اولاد ابوطالب سے تھے اور منصور اولاد عباس سے تھا اس لئے اپنی فضیلت ظاہر کرنے کے لئے اُس نے یہ حربہ استعمال کیا کہ ابوطالب کی ماں کے بطن سے سب کافر و مشرک ہی رہے اور چونکہ ابوطالب اور حضور صلعم کے والد حقیقی بھائی تھے اس لئے اُس نے اُن کے بھی کافر و مشرک ہونے کا فتویٰ دیدیا۔ غرض اس طرح منصور نے محمد نفس زکیہ کے مقابلہ میں اپنا حق خلافت ثابت کرنے کے لئے نہ صرف ابوطالب کو بلکہ آنحضرت صلعم کے والد اور اُن کی والدہ دونوں کو کافر قرار دیا۔
حضرت ابن عباسؓ جد منصور کی اس کے متعلق روایت موجود تھی ہی۔ اب شاہی سطح پر بھی آنحضرت صلعم کے والدین کے کافر و مشرک ہونے کا اعلان ہوگیا۔ اب کس کی مجال تھی جو اس نظریہ کی تردید کرتا۔ زیادہ سے زیادہ جو کیا گیا وہ یہ تھا کہ جامعین صحاح ستّہ نے آیۂ کریمۂ "ولا تسئل عن اصحاب الجحیم" کی شان نزول میں کعب الاحبار اور حضرت ابن عباس والی روایت کو داخل نہیں کیا لیکن چونکہ شاہی سطح پر اس نظریہ کا فتویٰ صادر ہوا

تھا جس کے خلاف کوئی زبان نہیں کھول سکتا تھا اس لئے اس کی تائید میں جو روایات واحادیث موضوعہ تھیں وہ رفتہ رفتہ تقدس کا جامہ پہنتی گئیں۔

مگر زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا۔ آخر وہ زمانہ بھی آیا جب لوگوں کو وہ روایات و احادیث جو حضور صلعم کے والدین اور جد امجد کے کفر و شرک پر دلالت کرتی تھیں، مشکوک نظر آنے لگیں۔ چونکہ یہ روایات تقدس کا جامہ پہن چکی تھیں اس لئے ان لوگوں کو یہ تو کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ یہ لوگ کافر و مشرک نہیں تھے، ہاں اُن کے نجات کے لئے متباول نظریات تلاش کرنے لگے۔

ایک گروہ علماء نے کہا کہ جو لوگ ایام جاہلیت میں بحالت کفر و شرک فوت ہوئے وہ از روئے آیۂ قرآن "وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا" (سورۂ بنی اسرائیل آیہ ۱۵) معذب نہیں ہوں گے بلکہ چونکہ اُنہیں دعوت دین حق ہی نہیں پہونچی اس لئے اُن کو نجات مل جائیگی آنحضرت صلعم کے ابوین اور جد امجد بھی اسی گروہ میں شامل ہیں اس لئے وہ بھی ناجی ہیں۔

علماء کے دوسرے گروہ نے اس نظریہ پر یہ اعتراض وارد کیا۔

"ان اهل الجاهلية لايجرى عليهم حكم من لم تبلغه الدعوة لتقدم دعوة ابراهيم وغيره

یعنی جو لوگ ایام جاہلیت میں گزرے ہیں اُن پر وہ حکم جاری نہ ہوگا جو اُن لوگوں سے متعلق ہے جن کو دعوت دین

من الانبیاء" | نہیں پہونچی کیونکہ اہل جاہلیت کو حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے ذریعہ دین پہونچ چکا تھا۔ (الرسائل التسع للسیوطی، رسالۃ التعظیم والمنۃ، ص ۳۶)

ان لوگوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ جب اہل جاہلیت خدا کے سامنے یہ عذر کریں گے کہ اے پروردگار! تو نے ہمارے زمانے میں ہماری ہدایت کے لئے کوئی نبی کیوں نہیں بھیجا۔ اگر تو کوئی نبی بھیجتا تو ہم یقیناً ایمان لے آتے۔ اس پر اللہ تعالےٰ آخرت میں اُن لوگوں کا امتحان لے گا جو ایمان میں پورے اُتریں گے وہ نجات یافتہ ہوں گے۔ جو امتحان میں ناکام رہیں گے انہیں دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔ آنحضرت صلعم کے والدین اور جد امجدؐ ان لوگوں میں ہوں گے جو امتحان میں کامیاب ہوں گے اور اس طرح عذاب سے نجات پائیں گے۔

تیسرے گروہ علماء نے اس نظریہ پر یہ اعتراض کیا کہ دنیا دار عمل ہے اور آخرت دار جزا۔ یہ آخرت میں امتحان لینا قرآن کی نصوص صریحہ کے خلاف ہے۔ اس گروہ نے ضعیف احادیث کا سہارا لیکر جن پر ہم نے اپنی کتاب میں تنقید کی ہے، یہ نظریہ پیش کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کے والدین اور جد امجد کو مرنے کے بعد زندہ کیا اور یہ تینوں ان کے ہاتھ پر اسلام لائے۔

چوتھے گروہ علماء نے اس نظریہ پر یہ اعتراض کیا کہ

"من مات کافراً لم ینفعه الایمان بعد الرجعة، بل لو آمن عند المعاینة لم ینفع، فکیف بعد الاعادة"

(ترجمہ) جو شخص کافر مرگیا ہو اُس کا زندہ ہوکر ایمان لانا فائدہ بخش نہیں بلکہ اگر وہ موت کا منظر دیکھ کر بھی ایمان لائے تو بھی وہ نفع بخش نہیں۔ دوبارہ زندہ ہوکر ایمان لانا تو بڑی چیز ہے (الرسائل التسع للسیوطی، رسالہ لسنشر العلمین المنفیین، ص ۱۳)

اور انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ آنحضرتؐ کے والدین اور جد امجد بھی زید ابن عمرو بن نفیل کی طرح جو حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی تھے دین ابراہیمی پر عامل اور موحد تھے۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ زید ابن عمرو بن نفیل کے موحد اور جنتی ہونے پر کسی کو اعتراض نہیں لیکن اگر آنحضرت صلعم کے والدین اور جد امجد کے لئے یہی بات کہی جائے تو کہنے والے کو فوراً رافضی اور جاہل بتا دیا جاتا ہے چنانچہ علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں یحییٰ بن حسین العلوی کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

"رافضیٌ متاخرٌ۔ اُتی بخبرٍ کذب، منه: إنّ ابوی النبی صلی اللّٰه علیه وسلم وجده فی الجنة، اُتّهم بوضعه هذا الجاهل"

(ترجمہ) یہ شخص رافضی ہے۔ اس نے وہ جھوٹی روایت بیان کی ہے جس کا متن یہ ہے کہ بہ تحقیق آنحضرت صلی اللہ کے والدین اور اُن کے جد امجد جنتی ہیں۔ یہ اس جاہل پر اس روایت کے وضع کرنے کا اتہام لگایا گیا ہے۔

(میزان الاعتدال، جلد ۴، ۳۶۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین اور جد امجد کے کافر و مشرک ہونے پر اس درجہ اصرار دیکھ کر علامہ جلال الدین عبدالرحمٰن السیوطی الشافعی المتوفی ۹۱۱ھ ہجری نے اُن کے موحد اور دین ابراہیمی کے پیرو ہونے کے متعلق چھ رسالے تالیف کیئے۔ ان میں انھوں نے یہ بھی ثابت کیا کہ آنحضرتؐ کے تمام آباؤ اجداد اور جدات و امہات سب موحد اور دین حق پر تھے۔ یہ چھوں رسالے مع دیگر تین رسالوں کے "الرسائل التسع" کے نام سے دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکے ہیں۔ ہمارے پاس اس کا وہ نسخہ ہے جو بار سوم ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔

علامہ سیوطی کا یہ وہ کارنامہ تھا جس پر انھیں ہر زمانے کے علماء نے خراج تحسین پیش کیا۔ چنانچہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے ان رسائل کے بارے میں "اشعۃ اللمعات" شرح مشکوٰۃ میں تحریر کیا۔

"امّا آبائے کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، پس ہمہ ایشاں از آدم تا عبداللہ طاہر و مطہر اند از دنس کفر و رجس شرک، چنانکہ فرمود: بیروں آمدہ ام از اصلاب طاہرہ بارحام طاہرہ، و دلائل

جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آبائے کرام کا تعلق ہے تو جاننا چاہیئے کہ وہ سب کے سب حضرت آدم سے لیکر عبداللہ تک کفر کی گندگی اور شرک کی نجاست سے طاہر و مطہر ہیں۔ اس پر حضور صلعم کا ارشاد شاہد ہے کہ

دیگر کہ متاخرین علمائے حدیث
آں را تحریر و تقریر نمودہ اند،
ولعمری ایں علمے است کہ حق تعالیٰ
سبحانہ مخصوص گردانیدہ است
بایں متاخراں را یعنی علم آنکہ آباؤ
اجداد شریف آنحضرت ہمہ بردین
توحید و اسلام بودند، و از
کلام متقدمین لائحے گردو کلمات
برخلاف آں، وذلک فضل اللہ
یوتیہ من یشاء ویختص بہ
من یشاء۔ وخدا جزائے خیر
دہد شیخ جلال الدین سیوطی را
کہ دریں باب رسائل تصنیف
کردہ اند، وافادہ و اجادہ نمودہ
ایں مدعا را ظاہر و باہر گردانیدہ
است۔ وحاشاء اللہ کہ ایں نور
پاک را در جائے ظلمانی پلید
جہ نہند و در عرصات آخرت بہ تعذیب
وتحقیر آباء او را مخزی و مخذول

میں طاہر مردوں کے صلبوں سے طاہر
عورتوں کے رحموں میں منتقل ہوتا ہوا
عالم وجود میں آیا ہوں۔ اور اس سلسلے
میں اور بھی دلائل ہیں جو متاخرین علمائے
حدیث نے بیان کئے ہیں اور لکھے
ہیں۔ اور مجھے اپنی جان عزیز کی قسم ہے
کہ یہ وہ علم ہے کہ جس سے خدا نے
علمائے متاخرین کو ممتاز کیا ہے یعنی
اس بات کا علم کہ آنحضرت صلعم کے
آباء و اجداد سب دین توحید و اسلام
پر عمل پیرا تھے۔ علمائے متقدمین کے کلام
سے اس کے خلاف نظریہ ظاہر ہوتا ہے۔
اور یہ اللہ کا فضل ہے جس کو وہ چاہتا ہے
عطا کرے اور جس کو چاہیے یہ خصوصیت
بخشے۔ خداوند عالم شیخ جلال الدین سیوطی
کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے اس
باب میں متعدد رسالے تصنیف کئے
اور اس مسئلہ کو بہترین طریقہ سے واضح
کیا۔ درحقیقت یہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا

گرداند" (اشعۃ اللمعات شرح فارسی مشکوٰۃ، جلد ۴، ص ۱۹۱)

کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے نور پاک کو تاریک اور گندے مقام میں جگہ دے اور میدان حشر میں اُن کے آباء و اجداد کو معذب بہ عذاب کر کے اور اُن کی تحقیر و تذلیل کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ذلیل و رسوا کرے۔

علامہ سیوطی کی وفات کے بعد سے جن کا انتقال ۹۱۱ھ مطابق ۱۵۰۵ء میں ہوا اس مسئلہ پر کہ آنحضرت صلعم کے والدین و جد امجد یا آپ کے دیگر آباء و اجداد کافر و مشرک تھے اسلامی ممالک کے کسی گوشہ سے زور نہیں دیا گیا لیکن حیرت ہے کہ ۱۹۶۵ء میں پاکستان اور ہندوستان کی جنگ کے دوران ہندوستان کے وزیر تعلیم چھاگلہ نے جو یہ بیان دیا کہ :-

"ہر پاکستانی اصلی مسلمان نہیں بلکہ نومسلم ہے۔ ہر پاکستانی کی رگوں میں ہندو خون دوڑ رہا ہے"

تو اس کے جواب میں مدیر تجلی، دیوبند نے جو دارالعلوم دیوبند کا ایک مانا ہوا ماہنامہ ہے، جنوری ۱۹۶۶ء کے شمارے میں تحریر کیا کہ پیغمبر اسلام کے والدین اور اُن کے جد عبدالمطلب بھی تو کافر تھے۔

اس پر ایک صاحب مصطفےٰ خاں ساکن احمد آباد نے مدیر موصوف سے استفسار کیا کہ اگر آنحضرت صلعم کے والدین اور جد امجد کافر تھے تو یہ وضاحت

کی جائے کہ پھر ہم ہر نماز میں یہ دعا کیسے مانگتے ہیں: اے اللہ! ہمارے نبی اکرم پر اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما جیسے تو نے رحمت نازل فرمائی ابراہیم پر اور ان کی آل پر۔ اگر وہ روحیں ناپاک ہوتیں تو ہم کیسے دعا میں کہتے کہ جیسے تو نے رحمت نازل فرمائی ابراہیم پر اور ان کی آل پر۔ ہمارا یہ عقیدہ اور ایمان ہے کہ خدا کی رحمت صرف ایمان والوں پر نازل ہوتی ہے۔ مشرکوں پر اس کا عذاب ہی نازل ہوتا ہے"

یہ استفسار اور مدیر تجلّی کی طرف سے اس کا جواب ماہنامہ "تجلّی" دیوبند بابت ماہ مئی ۱۹۶۶ء کے صفحات ۱۷ تا ۱۹ پر شائع ہوا ہے۔ جواب میں مدیر تجلی فرماتے ہیں:-

"ہمیں ہرگز اس سے دلچسپی نہیں ہے کہ حضور کے والدین کے شرک پر اصرار کریں۔ ہمارے نزدیک تو اس بحث میں پڑنا ہی احتیاط کے خلاف ہے۔۔۔۔ اب اعتراض ہی کیا گیا ہے تو بادلِ ناخواستہ جواب بھی پیش کرتے ہیں۔"

آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:-

"اگر پاک روح سے پیدا ہونے کا مطلب لازماً یہ ہو کہ پیدا ہونے والے کے والدین مشرک نہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کیا کہیں گے جو مسلّمہ طور پر ایک بُت پرست آذر کے بیٹے تھے"

پھر اور آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"آل ابراہیم کا مطلب بھی آپ نے غلط سمجھا۔ ہر اہل علم جانتا ہے کہ

آل سے مراد ہمیشہ خاندانی اور نسبتی سلسلہ نہیں ہوا کرتا بلکہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی کے اُسوہ کی پیروی کریں یا اندازِ فکر اور عقائد و نظریات میں مماثلت رکھتے ہوں۔ قرآن میں جہاں جہاں آل فرعون کا ذکر آیا ہے ملاحظہ فرما لیجئے کہ پیروانِ فرعون ہی مراد ہیں نہ کہ اُس کے رشتہ دار۔ دُعائے ابراہیمی میں بھی آل سے مراد وہی لوگ ہیں جنہوں نے ابراہیمی دعوت کو قبول کیا، حق پرست بنے۔ نکوکاری کی زندگی بسر کی۔ وہ لوگ ہرگز مراد نہیں ہیں جن کا سلسلۂ نسب کسی نہ کسی پشت میں حضرت ابراہیم سے جا ملتا ہو خواہ وہ مشرک و کافر ہی رہے ہوں"

گویا مدیر تجلّی کے نزدیک حضرت عبداللہ پدر آنحضرت صلعم اور ان کے دادا عبد المطلب آل ابراہیم میں بھی داخل نہیں۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"تمام مورخین اس پر متفق ہیں کہ حضور صلعم کی بعثت جس زمانہ میں ہوئی وہ زمانہ ایسا ہی تھا کہ پچھلے کسی پیغمبرؑ کی تعلیمات محفوظ نہیں رہی تھیں توحید نایاب تھی۔ اخلاقی قدروں کی ہر آسمانی بنیاد جہالت کے انبار میں دب چکی تھی۔ بت پرستی، مظاہر پرستی اور الابلا پرستی کے سوا کوئی روشنی، کوئی ہدایت کوئی صراطِ مستقیم نظر نہیں آتی تھی۔ یہ صرف مورخین کا ہی بیان نہیں بلکہ آثار و حدیث اس پر شاہد عدل ہیں۔ پھر یہ دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ کے والدین اس ماحول میں توحید پرست رہے ہوں گے؟"

کچھ اور آگے چل کر تحریر کرتے ہیں:۔

"سورۂ الفیل سے حضورؐ کے دادا کا توحید پرست ہونا ثابت ہوتا ہے یہ بھی درست نہیں ..... اگر ہم غلط کہہ رہے ہوں تو آپ علمائے سلف میں سے کسی ایک کا نام تو لیجئے جس نے حضورؐ کے دادا عبدالمطلبؓ کو توحید پرستوں" میں شمار کیا ہو"

اقتباسات مذکورہ بالا سے ظاہر ہے کہ مدیر تجلّی کے نزدیک۔

(۱) جناب ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حقیقی والد کا نام آزر تھا جو مسلّمہ طور پر بُت پرست تھا۔

(۲) آنحضرت صلعم کے والدین مشرک تھے۔

(۳) آنحضرت صلعم کے دادا عبدالمطلب توحید پرست نہیں تھے اُن کے مُوحّد ہونے پر علمائے سلف میں سے کسی کا قول نہیں ملتا۔

(۴) آنحضرت صلعم کے والد اور دادا آلِ ابراہیم میں داخل نہیں۔

ہمیں اس سے تو کوئی غرض نہیں کہ مدیر ماہنامہ تجلّی کا حضور صلعم کے والدین اور جد امجد کے متعلق یہ نظریہ کیوں ہے لیکن ہاں اس پر ضرور افسوس ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے جو مدت سے مسلمانوں کی مذہبی خدمات انجام دے رہا ہے، اس دور مادیت میں کہ جب ہمارے نوجوان طبقہ کو علم عربی اور مذہبیات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اور جب مغرب سے آئے دن اسلام اور بانئ اسلام کے متعلق زہر اگلا جا رہا ہے، اس اہم اور نازک مسئلہ پر اس قدر سطحی انداز میں اظہار رائے کیا

جائے۔ کاش انھوں نے اتنا ہی غور کرلیا ہوتا کہ ہمارا نوجوان طبقہ جو آئے دن انگریزی رسائل میں علمائے نصاریٰ کے یہ مضامین دیکھتا اور پڑھتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام معاذ اللہ ابن اللہ تھے، خدا کا جزو تھے، وہ یہ پڑھ کر کہ پیغمبر اسلام کے باپ دادا کافر تھے، ان کے متعلق کیا خیال کرے گا۔ کیا ان کے دلوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقیقی معنوں میں کوئی وقعت رہے گی۔ کیا وہ پیغمبر اسلام کو افضل الانبیاء تسلیم کریں گے۔ کیا وہ نصرانیت کے مقابلہ میں دین اسلام کو ترجیح دیں گے۔

یہ وجوہات اور خدشات تھے جنہوں نے مجھے اس کتاب کے لکھنے پر مجبور کیا۔ اس سلسلہ میں نہ مجھے کسی ستائش کی تمنّا ہے اور نہ صلہ کی پروا ہے۔ میں نے یہ سعی و کاوش خوشنودی خدا و رسول کے لئے کی ہے اور انہیں سے اس کے اجر کا متمنی ہوں۔

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے جن کے عنوان حسب ذیل ہیں:۔

(۱) باب اوّل: جناب عبدالمطلب جدّ نامدار حضرت رسولِ مختار کے مذہب کے بیان میں۔

(۲) باب دوئم: جناب عبداللہ پدر عالی قدر حضرت رسول اللہؐ کے مذہب کے بیان میں۔

(۳) باب سوئم: آنحضرت صلعم کی والدہ جناب آمنہ کے مذہب کے بیان میں

(۴) باب چہارم: اس امر کے بیان میں کہ پیغمبر اسلام کے تمام آباو

واجداد و اُمہات و جدات دین حق پر تھے۔

(۵) باب پنجم: اس مسئلہ کی تحقیق میں کہ آیا آزر جناب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ تھا؟

(۶) باب ششم: اس سوال کے جواب میں کہ جب بقولِ مشہور حضور صلعم کے آباء و اجداد ہمیشہ خانۂ کعبہ کے متولی رہے تو اُنھوں نے موحّد ہوتے ہوئے اُس میں بتوں کو کیوں نصب ہونے دیا؟

(۷) باب ہفتم: اس سوال کے جواب میں کہ کیا یہ حقیقت نہیں کہ آنحضرت صلعم کے آباء کرام از قصیؔ تا ابوطالب بحیثیت متولیان خانۂ کعبہ بتوں کے چڑھاوے کی رقم حُجاج کے کھانے پینے اور دیگر مصارف حج پر خرچ کرتے تھے؟

(۸) آخر میں دُعا ہے کہ حق سُبحانہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک کے صدقہ سے میری اس پُرخلوص سعی و کاوش کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

اس کتاب کا نام "دین آباء النبیؐ" رکھا گیا ہے۔

باب اوّل

جناب عبد المطلب جدّ نامدار حضرت رسول مختارؐ کے مذہب کے بیان میں

پیغمبر اسلام علیہ الصّلوٰۃ والسلام کے آبار و اجداد میں قریب ترین بزرگ آپ کے والدین اور جدّ امجد جناب عبد المطلب ابن ہاشم ہیں۔ یہی وہ بزرگوار ہیں جن کے حالت کفر و شرک میں مرنے اور جہنمی ہونے پر علمائے متقدمین نے پوری کوششیں صرف کی ہیں یہاں تک کہ اگر کسی شخص نے کسی صحابی کا کوئی قول اُن کے جنّتی ہونے پر بیان کر دیا تو اُس کو بے محابا جاہل قرار دیدیا گیا۔ چنانچہ علّامہ ذہبی المتوفی ۷۴۸ھ ہجری یحییٰ بن الحسین علوی کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:۔

اتی بخبرٍ کذبٍ متنہٗ: انّ ابوی النبی صلی اللہ علیہ وسلم	یعنی اس نے ایک جھوٹی خبر بیان کی ہے جس کا متن یہ ہے کہ بہ تحقیق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

وَجَدّہٗ فی الجنّۃ، اتّھم بوضعہ ھذا الجاھل۔ (میزان الاعتدال، جلد ۴، ص ۲۶۸، مطبوعہ مطبع عیسیٰ البابی الحلبی مصر، الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۸۲ھ)	کے والدین اور اُن کے جد جنت میں ہیں۔ یہ جاہل اس قول کے وضع کرنے کا متہم قرار دیا گیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانے میں ایسے علماء بھی ہوئے جنہوں نے اس نظریہ کے خطرات سے آگاہ کیا۔ مثلاً قاضی ابوبکر بن العربی المتوفی ۵۴۳ھ ہجری سے جو مذہب مالکیہ کے مشہور امام ہیں، ایک ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو یہ کہتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پدر عالی قدر کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ قاضی موصوف نے یہ سُنکر جواب دیا کہ وہ ملعون ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: "بہ تحقیق جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں، اللہ اُن پر دُنیا اور آخرت میں لعنت کرتا ہے" (سورۂ احزاب، آیہ ۵۷) اور رسول صلعم کے لئے اس سے زیادہ ایذا دینے والی چیز اور نہیں ہوسکتی کہ اُن کے والد ماجد کے لئے یہ کہا جائے کہ وہ دوزخ میں ہیں (رسالۂ السّبل الجلیۃ للسیوطی ص ۱۸-۱۹)۔ لیکن اس نظریہ کے ابطال میں کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی۔ سوادِ اعظم میں یہ شرف سب سے پہلے علامہ جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی المتوفی ۹۱۱ھ ہجری کو حاصل ہوا جنہوں نے آنحضرت صلعم کے والدین اور آپ کے تمام آباء و اجداد

اور آبہات وجدات کے موحد اور مسلم ہونے پر متعدد رسالے لکھے اور مخالفین کے تمام اعتراضات کا دندان شکن جواب دیا۔ علمائے حق پسند نے علامۂ سیوطی کے اس فعل کو مستحسن قرار دیا چنانچہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی اُن کے متعلق تحریر کرتے ہیں:۔

"وخدا جزائے خیر دہد شیخ جلال الدین سیوطی را کہ دریں باب رسائل تصنیف کردہ اند، و افادہ و اجادہ نمودہ ایں مدعا را ظاہر و باہر گردانیدہ است، و حاشا اللہ کہ ایں نور پاک را در جائے ظلمانی پلید بہ نہد و در عرصات آخرت بہ تعذیب و تحقیر آباء او را مخزی و مخذول گرداند"

(اشعۃ اللمعات فارسی شرح مشکوۃ، جلد ۴، ص ۹۱۴، مطبوعہ مطبع منشی نول کشور، ہند)

خداوند عالم شیخ جلال این سیوطی کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے اس باب میں متعدد رسالے تصنیف کئے اور اس مسئلہ کو بہترین طریقہ سے واضح کیا۔ اور یہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کے نور پاک کو تاریک اور گندے مقام میں جگہ دے اور میدان حشر میں اُن کے آباء کو عذاب دیکر اُن کو ذلیل و رسوا کرے۔

یہ تمام رسالے "الرسائل التسع" کے نام سے مطبعۂ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکے ہیں۔ ہمارے پاس اس کتاب کا وہ نسخہ ہے جو ۱۹۶۱ء میں بار سوم طبع ہوا ہے۔

جناب عبدالمطلب کے موحّد ہونے پر تاریخی شواہد

اگر روایت پرستی سے دور رہتے ہوئے جناب عبدالمطلب کے متعلق واقعات تاریخی کو ناقدانہ انداز میں دیکھا جائے تو اُن کی شخصیت کے بارے میں بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ایسا ضیا بار فانوس ہے جس سے شمع توحید کی شعاعیں چھن چھن کر اہل بصیرت کے قلب و نظر کو منوّر کر دیتی ہیں۔ لیکن غلط روایات بھی امتداد زمانہ کی وجہ سے تقدس کا جامہ پہن لیتی ہیں اور ذہن انسانی کو مرعوب کرنے میں اچھا خاصہ کردار ادا کرتی ہیں۔ کتب سیر و تواریخ میں جناب عبدالمطلب کے موحّد ہونے پر اس قدر کثرت سے واقعاتی شہادتیں ملتی ہیں کہ غلط روایات کے باوجود مورخین اور سیرت نگاروں کو اُن کے متعلق یہ لکھنا پڑا کہ وہ آخر عمر میں توحید پرست ہو گئے تھے۔ چنانچہ علامہ حلبی نے ان غلط اور باطل روایات کو نقل کرنے کے باوجود اُن کے متعلق لکھا ہے: "ورفض فی آخر عمرہٖ عبادۃ الاصنام و وحّد اللہ سبحانہ وتعالیٰ" یعنی انھوں نے اپنی عمر کے آخری حصّہ میں بتوں کی پرستش چھوڑ دی تھی اور حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی توحید کے قائل ہو گئے تھے۔ (سیرۃ الحلبیہ جلد ۱ ص ۴)۔ علامہ حلبی کا یہ قول کہ حضرت عبدالمطلب نے آخر عمر میں بُت پرستی ترک کر دی تھی غلط روایات اور موضوع احادیث سے مرعوب ہونے کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے ورنہ کتب سیر و تواریخ اس حقیقت پر پوری پوری روشنی ڈالتی ہیں کہ اُن کی تمام عمر توحید پرستی اور ملّت ابراہیمی کی پیروی میں گزری اور اُنھوں نے

چشم زدن کے لئے بھی بُت پرستی اختیار نہیں کی۔ ہم ان غلط روایات اور موضوع احادیث پر انشاء اللہ اسی باب میں آگے چل کر نقد و تبصرہ کریں گے۔ سردست ہم جناب عبد المطلب کی زندگی کے وہ چند واقعات ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جن سے ثابت ہو گا کہ وہ اپنی تمام عمر تمبع توحید کے پروانے بنے رہے اور اُن کا دامنِ عمل طرفتہ العین کے لئے بھی کفر و شرک کی گندگی سے آلودہ نہیں ہوا۔

(۱) جناب عبد المطلب کی عمر کے متعلق مشہور ترین قول یہ ہے کہ "عاش مائۃ واربعین سنۃ" یعنی وہ ایک سو چالیس سال زندہ رہے (سیرۃ الحلبیۃ، جلد ۱، ص ۴)۔ اُن کے کل سولہ (۱۶) اولاد ہوئیں۔ دس لڑکے اور چھ لڑکیاں۔ ابھی آپ کے صرف ایک لڑکا حارث تھا کہ جس سے آپ کی کنیت ابو الحارث مشہور ہے کہ آپ کو خواب میں چاہ زمزم کھودنے کی بشارت دی گئی جو اُس وقت تک نامعلوم حالت میں پٹا پڑا ہوا تھا۔ یہ کنواں اساف اور نائلہ دو بتوں کے درمیان واقع تھا جہاں قریش چڑھاوے کے جانور قربان کیا کرتے تھے۔ جب جناب عبد المطلب اور اُن کے فرزند حارث زمزم کھودنے میں مصروف ہوئے تو قریش نے مخالفت کی اور کہا کہ ہم اپنے بتوں کے درمیان کنواں کھودنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ جناب عبد المطلب اور حارث نے مقابلہ کیا اور بہ مشکل قریش پر غلبہ پایا اور چاہ زمزم کھودا۔ اس مخالفت کے موقع پر آپ نے نذر کی کہ "لئن اتانی اللہ عشرۃ من اولاد الذکور لانحرن احدھم عند الکعبۃ" یعنی اگر اللہ نے

مجھے دس فرزند عطا کئے تو میں اُن میں سے ایک کو کعبہ کے پاس راہ خدا میں قربان کروں گا۔ (سیرۃ الحلبیہ، جلد ۱، ص ۳۴)۔ یہ آپ کے شباب کا زمانہ تھا اور قریش کا بت ہُبل خانۂ کعبہ میں نصب تھا۔ اگر جناب عبد المطلب جوانی کے عالم میں اصنام پرستی کرتے ہوتے تو ہُبل کی نذر مانتے۔ اللہ کی نذر نہ مانتے۔ لیکن چونکہ وہ موحّد تھے اس لئے انہوں نے اللہ کی نذر مانی اور ہُبل یا کسی دوسرے بُت کی طرف توجہ بھی نہیں کی۔

(۲) جناب عبد المطلب اسی مسلک توحید پر گامزن رہے تا آنکہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے اُنہیں دس فرزند کرامت فرمائے۔ جب یہ حدّ بلوغ کو پہونچ گئے تو ایک روز خواب میں اُن سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنی نذر کو پورا کریں۔ چنانچہ صبح اُنھوں نے اپنے تمام فرزندوں کو طلب کیا اور اُن سے اپنی نذر اور اس کے ایفا کرنے کے ارادہ کا ذکر کیا۔ سب نے کہا ہم حاضر ہیں۔ آپ جو کرنا چاہتے ہیں شوق سے کریں۔ آپ نے فرمایا کہ تم سے ہر شخص ایک ایک تیر پر اپنا نام لکھ کر لے آئے۔ انہوں نے تعمیل حکم کی اور جناب عبد المطلب اُن سب کو لیکر ہُبل بُت کے قریب آئے جس کے پاس فال کے تیر رکھے ہوئے تھے جن سے قرعہ اندازی کی جاتی تھی اُنھوں نے ہُبل کے خدمتگار سے کہا کہ وہ اپنے دس فرزندوں میں سے نذر کے سلسلہ میں ایک فرزند کی قربانی کرنا چاہتے ہیں۔ قرعہ اندازی کی جائے۔ چنانچہ تیروں سے قرعہ اندازی کی گئی اور قرعہ حضرت عبد اللہ کے نام آیا۔ جناب عبد المطلب چھری ہاتھ میں لئے ہوئے حضرت عبد اللہ کا ہاتھ

پکڑ کر قربان گاہ میں لائے اور انہیں زمین پر ٹپک کر چھری اُن کے گلے پر رکھدی۔ یہ دیکھکر سرداران قریش نے کہا کہ اے عبد المطلب! اِس معاملہ میں جلدی نہ کیجئے ورنہ یہ ہمیشہ کے لئے سُنت قرار پا جائے گی مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب مل کر حجاز چلیں۔ وہاں ایک عرّافہ قبیط نامی رہتی ہے جس کے ایک جن تابع ہے۔ اُس سے مشورہ کیا جائے۔ وہ جو کچھ کہدے اُس پر ہم سب عمل کرنے کو تیار ہیں۔ جناب عبد المطلب نے سرداران قریش کی یہ بات مان لی اور سب عرّافہ کی تلاش میں حجاز روانہ ہوئے۔ وہاں پہونچ کر عرّافہ سے ملے تو اُس نے کہا کہ آج میں اپنے تابع سے دریافت کر کے کل جواب دوں گی۔ دوسرے دن جب یہ لوگ عرّافہ کے پاس گئے تو اُس نے کہا تمہارے یہاں قتل کی دیّت کیا ہے۔ انہوں نے کہا: دس اونٹ۔ عرّافہ نے کہا کہ اب تمہیں یہ کرنا ہے کہ عبد اللہ اور دس اونٹوں میں قرعہ اندازی کی جائے۔ اگر پھر عبد اللہ ہی کے نام قرعہ آئے تو دس اونٹ اور اضافہ کئے جائیں اور پھر عبد اللہ اور ان بیس اونٹوں میں قرعہ اندازی کی جائے۔ اگر پھر عبد اللہ ہی کا نام آئے تو اسی طرح دس دس اونٹ اضافہ کئے جاتے رہیں تا اینکہ اونٹوں کے نام قرعہ آجائے۔ سب نے اس تجویز کو پسند کیا اور یہ لوگ لوٹ کر مکہ معظمہ واپس آگئے۔ اب حضرت عبد المطلب پھر خدمتگار ہبل کے پاس آئے جس کی تحویل میں فالوں کے تیر تھے اور اُس سے اپنے فرزند عبد اللہ اور اونٹوں کے درمیان عرّافہ کی تجویز کے مطابق قرعہ اندازی کرنے

کو کہا۔ اس قرعہ اندازی کے موقع پر جناب عبدالمطلب کے کردار کا نقشہ ہم سیرت ابن ہشام سے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"جب سب اس رائے پر متفق ہو گئے تو عبدالمطلب اللہ تعالیٰ سے دُعا کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے اور عبداللہ کو اور دس اونٹوں کو وہاں لے آئے اس حالت میں کہ عبدالمطلب کھڑے ہوئے اللہ عزوجل سے دُعا کر رہے تھے۔ پھر تیر نکالا گیا تو عبداللہ پر نکلا۔ دس اونٹ زیادہ کیے گئے یعنی اونٹوں کی تعداد بیس ہو گئی۔ عبدالمطلب کھڑے اللہ عزوجل سے دُعا کر رہے تھے۔ پھر تیر نکالا گیا تو عبداللہ پر ہی نکلا۔ دس اونٹ اور زیادہ کئے گئے یعنی اونٹوں کی تعداد تیس ہو گئی۔ عبدالمطلب کھڑے اللہ عزوجل سے دُعا کر رہے تھے۔ پھر تیر نکالا گیا تو عبداللہ پر ہی نکلا۔ دس اونٹ زیادہ کئے یعنی اونٹوں کی تعداد چالیس ہو گئی۔ عبدالمطلب کھڑے اللہ عزوجل سے دُعا کر رہے تھے۔ پھر تیر نکالا تو عبداللہ پر ہی نکلا۔ دس اونٹ زیادہ کئے یعنی اونٹوں کی تعداد پچاس ہو گئی۔ عبدالمطلب کھڑے اللہ تعالیٰ سے دُعا کر رہے تھے۔ دس اونٹ زیادہ کئے یعنی اونٹوں کی تعداد ساٹھ ہو گئی۔ عبدالمطلب کھڑے اللہ تعالیٰ سے دُعا کر رہے تھے۔ پھر تیر نکالا تو عبداللہ پر ہی نکلا۔ دس اونٹ زیادہ کئے یعنی اونٹوں کی تعداد ستر ہو گئی۔ عبدالمطلب کھڑے اللہ تعالیٰ سے دُعا کر رہے تھے۔ پھر تیر نکالا تو عبداللہ پر ہی نکلا۔ دس اونٹ زیادہ کئے یعنی اونٹوں کی تعداد اسّی ہو گئی۔ عبدالمطلب کھڑے اللہ تعالیٰ سے دُعا کر رہے تھے۔ پھر تیر نکالا

تو عبداللہ پر ہی نکلا۔ دس اونٹ زیادہ کئے یعنی اونٹوں کی تعداد نوّے ہوگئی۔ عبدالمطلب کھڑے اللہ تعالیٰ سے دُعا کر رہے تھے۔ پھر تیر نکالا تو عبداللہ پر ہی نکلا۔ دس اونٹ زیادہ کئے یعنی اونٹوں کی تعداد سنو ہوگئی۔ عبدالمطلب کھڑے اللہ تعالیٰ سے دُعا کر رہے تھے۔ پھر تیر نکالا تو اب کے اونٹوں پر نکلا۔ قریش اور جو لوگ وہاں موجود تھے سب ہی نے کہا: اے عبدالمطلب! اب تم اپنے رب کی رضامندی پر پہونچ گئے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ عبدالمطلب نے کہا: اللہ کی قسم ایسا نہیں یہاں تک کہ تین مرتبہ اونٹوں پر ہی تیر نکلے۔ پھر عبداللہ اور اونٹوں کے لئے تیر نکالے۔ عبدالمطلب کھڑے اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے تھے کہ تیر اونٹوں پر ہی نکلا۔ مکرر یہ عمل کیا اور عبدالمطلب کھڑے اللہ تعالیٰ سے دُعا کر رہے تھے۔ پھر تیر نکالا تو اونٹوں ہی پر نکلا۔ چنانچہ اونٹ ذبح کئے گئے اور اُنہیں یعنی عبداللہ کو چھوڑ دیا گیا۔ کسی شخص کو اُن کے گوشت سے نہ محروم کیا اور نہ روکا" (اردو ترجمہ سیرۃ ابن ہشام، جلد ۱، ص ۱۵۰-۱۵۱)۔

کیا اس سے بڑھ کر تصورِ توحید ذہن میں آسکتا ہے کہ نو مرتبہ خداوند عالم سے دُعا کرتے ہوئے قرعہ جناب عبداللہ ہی کے نام پر آئے لیکن جناب عبدالمطلب کے پائے ثبات میں ذرہ برابر لغزش نہ آئے اور وہ دسویں مرتبہ بھی خدائے برتر و اعلیٰ ہی سے دُعا کریں اور کسی بت کی طرف اُن کی توجہ مبذول نہ ہو۔ یہ کردار اُسی شخص کا ہوسکتا ہے جس کے رگ و ریشہ

میں نظریۂ توحید سرایت کر گیا ہو۔

(۳) جس سال جناب عبد اللہ اور آمنہ کی شادی ہوئی اُسی سال اُبرہہ نے جو نجاشی بادشاہ حبشہ کی طرف سے حاکم یمن تھا خانۂ کعبہ کے منہدم کرنے کے ارادہ سے ہاتھیوں کی فوج کے ساتھ مکّہ معظمہ پر حملہ کیا۔ سرزمین مکّہ پر ابرہہ کے قیام کے زمانہ میں اُس کے فوجی جناب عبد المطلب کے دو سَو اونٹ پکڑ لے گئے۔ اس پر انھوں نے ابرہہ سے ملاقات کی درخواست کی۔ اُبرہہ نے یہ معلوم کر کے کہ عبد المطلب رئیس قریش اور متولی خانۂ کعبہ ہیں اُنہیں ملاقات کا موقع دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ اُس سے خانۂ کعبہ کے منہدم کرنے سے باز رہنے کی درخواست کریں گے لیکن اُس کے تعجب کی کوئی حد و انتہا نہ رہی جب اُس نے یہ دیکھا کہ عبد المطلب اپنے گرفتار شدہ اونٹوں کی واپسی کی درخواست کر رہے ہیں۔ اُبرہہ نے اونٹوں کی واپسی کا تو حکم دیدیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میرے دل میں آپ کی بڑی عزت تھی لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ کو اپنی عبادت گاہ کے مقابلہ میں اپنی ذاتی چیز کا زیادہ خیال ہے تو میرے دل سے آپ کی عظمت جاتی رہی۔ جناب عبد المطلب یہ کہتے ہوئے کہ

"انا ربّ الابل وللبیت ربٌّ یحمیہ" یعنی میں اونٹوں کا مالک ہوں اس لئے مجھے اُن کی فکر ہے اور اس بیت (خانۂ کعبہ) کا بھی مالک موجود ہے جو خود اس کی حفاظت کرے گا اُبرہہ سے رخصت ہوئے۔ پھر آپ نے خانۂ کعبہ کے دروازہ کی زنجیر تھام کر اس طرح خدا سے دُعا کی:۔

یا ربِّ لا اَرجو لھم سواکا　　یا ربِّ فامنع منھم حماکا
اِنّ عدوّ البیت من عاداکا　　اِمنعھم اَن یّخربوا فناکا

(ترجمہ) اے پالنے والے میں ان کے بارے میں تیرے سوا اور کسی سے اُمید نہیں رکھتا۔ پروردگارا ان سے تو ہی اپنے گھر کی حفاظت فرما۔ بلاشبہ تیرے گھر کا دشمن وہی ہو سکتا ہے جو تیرا دشمن ہے۔ تو ان کی دستبرد سے اپنے گھر کی حفاظت فرما۔ (تاریخ کامل لابن اثیر، جلد ۱، ص ۲۶۱)

سیرۃ ابن ہشام میں ہے کہ جس روز جناب عبدالمطلب کو خبر ملی کہ کل اُبرہہ خانۂ کعبہ کو منہدم کرے گا اُس روز وہ دروازۂ کعبہ کے حلقہ کو پکڑ کر نہایت عجز وانکساری کے ساتھ رو رو کر یوں دُعا کرنے لگے:۔

لَاھُمَّ اِنَّ الْعَبْدَ یَمْ　　نع رحلہ، فامنع حِلالک
لا یَغلِبنّ صلیبھم　　ومحالھم غدْوًا محالک

(ترجمہ): اے اللہ بندہ اپنی قیام گاہ کی حفاظت کرتا ہے، پس تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما۔ کل اُن کی صلیب اور اُن کی طاقت تیری طاقت وقوت پر غالب نہ ہو جائے۔ (اُردو ترجمہ سیرۃ ابن ہشام، جلد ۱، ص ۵۰)

یہ رجوع الی اللہ اسی شخص کا کام ہو سکتا ہے جس کے رگ و ریشہ میں عقیدۂ توحید سرایت کر گیا ہو۔ اگر جناب عبدالمطلب کا ذہن مائل بہ کفر و شرک ہوتا تو وہ بھی اس مشکل اور پریشانی کے وقت وہی "اُعلُ ھُبل" کا نعرہ لگاتے جو جنگ اُحد کے موقع پر ابو سفیان لگا

رہا تھا۔ لیکن انھوں نے ابتداء سے بتوں سے کوئی تعلق نہیں رکھا تھا اور وہ صرف خدائے وحدہ لاشریک لہٗ کی پرستش کیا کرتے تھے۔

(۴) ایام جاہلیت میں کفّار قریش میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی بچّہ پیدا ہوتا تھا تو اُس کو ہبل نامی بُت کے پیروں میں ڈال دیتے تھے اور اُس کے پیروں کے قریب کی خاک بطور سُرمہ بچّہ کی آنکھوں میں ڈالتے تھے۔ اور اُس کے آگے اُس بچّہ کی طول عمر کے لئے دُعا کیا کرتے تھے لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ جب آنحضرت صلعم پیدا ہوئے اور جناب آمنہ نے اس کی خبر حضرت عبد المطلب کے پاس بھیجی تو اُنھوں نے آکر حضور صلعم کو گود میں لیا اور ہبل بُت کے پاس لے جانے کی بجائے اُن کو سیدھے خانۂ کعبہ میں لیگئے اور وہاں پہونچکر بقول صاحب سیرۃ الجلبیۃ "قام یدعو اللّٰہ ویشکرہٗ لہٗ ما اعطاہ" یعنی بچّہ کے لئے اللّٰہ سے دُعا کرنے لگے اور اُس کی بخشش و نعمت پر اُس کا شکر ادا کرنے لگے۔

(سیرۃ الجلبیۃ، جلد ۱، ص ۷۶)۔ بعض تاریخوں میں مذکور ہے کہ اس موقع پر آپ نے چند رجزیہ اشعار بھی کہے جن سے بھی آپ کی توحید پرستی پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ اشعار یہ ہیں:۔

الحمد للّٰہ الذی اعطانی	ھٰذا الغلام الطیّب الاردان
قد ساد فی المھد علی الغلمان	اُعیذہٗ بالبیت ذی الارکان
حتی اراہ بالغ البنیان	اُعیذہٗ من شرّ ذی شنآن

من حاسدٍ مضطرب العنان

(ترجمہ):- سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھکو یہ پاک و پاکیزہ اور خوبصورت بچہ عطا کیا۔ مہد میں ہی اسے اور بچوں پر شرف حاصل ہے۔ میں اسے اللہ کے گھر کی پناہ میں دیتا ہوں تا اینکہ میں اس کو بالغ دیکھ لوں۔ میں اُس کے لئے ہر بغض رکھنے والے اور حسد رکھنے والے شخص کے شر سے خدا کی پناہ میں رہنے کی دُعا کرتا ہوں۔ (روضۃ الاحباب، جلد ا، ص ۵۵، مطبوعہ مطبع انوار محمدی لکھنؤ)۔

(۵) منقول ہے کہ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عمر پانچ یا چھ سال کی تھی کہ قریش کو کئی سال تک قحط اور خشک سالی کا سامنا ہوا۔ لوگ جناب عبدالمطلب کے پاس آئے اور آن سے اپنی مصیبت بیان کی۔ آپ نے کہا کہ کل ہر خاندان سے ایک ایک منتخب شدہ آدمی میرے پاس آجائے۔ تعمیل حکم ہوئی۔ جناب عبدالمطلب ان لوگوں کو، اپنی تمام اولاد کو اور آنحضرت صلعم کو کوہ ابوقبیس پر لے گئے۔ پھر آپ دُعا کرنے کھڑے ہوئے اور بمنت وزاری بارگاہِ احدیت میں عرض کرنے لگے:-

"اللّٰھُمَّ ھٰوُلاءِ عبیدک وبنو عُبیدک و اِماءُک وبنوا اِمائک، وقد نزل بنا ماتری، وتتابعت علینا ھٰذہ السنون، فذھبت بالظُلف والخف والحافر، فاشفقت علی الانفس، فاذھب عنا الجدب وائتنا بالحیاء والخصب"۔ (سیرۃ الحلبیہ، جلد ا، ص ۱۰۶)

(ترجمہ): اے اللہ! یہ تیرے غلام اور تیری کنیزیں تیرے سامنے حاضر ہیں۔

تو دیکھ رہا ہے جو مصیبت ہم پر پڑی ہوئی ہے۔ ہمیں سالہا سال سے قحط کا سامنا ہے جس نے اونٹوں، گائے بیلوں، گھوڑوں اور خچروں کا صفایا کر دیا ہے۔ جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ پس تو ہم سے اس خشک سالی کو دور کر دے اور بارش اور سرسبزی و شادابی سے ہمیں سرفراز فرما۔

مورخین کا بیان ہے کہ "فما برحوا حتی سالت الاودیۃ" یعنی ابھی یہ لوگ کوہ ابوقبیس پر مصروف دعا ہی تھے کہ اتنی سخت بارش ہوئی کہ وادیاں بہ نکلیں۔ (سیرۃ الحلبیۃ، جلد ۱، ص ۱۰۶)

(۶) کہتے ہیں کہ یہ بارش قبیلۂ قیس اور قبیلۂ مضر کے شہروں میں نہیں ہوئی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ جناب عبد المطلب کی دعا کی برکت سے دیگر قبائل قریش کے شہر اور دیہات سیراب ہو گئے تو وہ بھی ایک وفد کی شکل میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے دعا کے لئے استدعا کی۔ جناب عبد المطلب نے ان کی عرضداشت کو قبول کیا اور ان سے دوسرے روز عرفات میں حاضر ہونے کو کہا۔ چنانچہ دوسرے روز قبیلۂ قیس اور مضر کے وفد کے ارکان وعدہ گاہ پر جمع ہوئے اور ادھر جناب عبد المطلب اپنی اولاد اور جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لیکر عرفات میں پہونچے۔ پھر آپ دعا کرنے کے لئے کھڑے ہوئے اور نہایت عجز و انکساری کے ساتھ اس طرح بارگاہ احدیت میں دعا کرنے لگے:۔

"اللّٰھم ربّ البرق الخاطف، والرعد القاصف، ربّ الارباب، وليّن الصعاب، ھٰذہ قیسٌ ومُضر، من خیر البشر، قد شعثت رؤوسھا وحدبت ظھورھا۔ تشکو الیک شدّۃ الھزال وذھاب النفوس والاموال، اللّٰھم فاتح لھم سحابًا خوارۃً وسماءً خرارۃً لتضحک ارضھم ویزول ضرّھم" (سیرۃ الحلبیہ، جلد ۱، ص ۱۰۱)

(ترجمہ): اے اللہ! چمکتی ہوئی بجلی اور گرجتے ہوئے بادل کے مالک، اے سرداروں کے سردار۔ اے مشکلوں کے آسان کرنے والے۔ یہ قبیلۂ قیس اور مضر کے بہترین لوگ ہیں۔ اور ان کے سر خاک آلودہ ہو گئے ہیں۔ اور ان کی پشتیں جھک گئی ہیں۔ یہ لاغری اور نقصان جان و مال کی تجھ سے شکایت کرتے ہیں۔ اے اللہ! ان پر موسلا دھار بارش برسا تاکہ ان کی زمینیں اور ان کی کھیتیاں لہلہا اُٹھیں اور ان کی ساری کوفت اور ساری تکلیف دور ہو جائے۔

ایامِ جاہلیت میں دعائے استسقاء کے یہ دونوں واقعات جناب عبدالمطلب کی توحید پرستی پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ اگر وہ بُت پرست ہوتے یا بت پرستی کی طرف اُن کا میلان ہوتا تو طلبِ باراں کی درخواست کے موقع پر وہ بھی کم و بیش اسی عقیدہ کا اظہار کرتے جو قوم عمالقہ کے سرداروں نے عمرو بن لُحی سے کیا تھا جس نے سرزمین عرب میں بت پرستی کو رائج کیا۔ مورخین کا بیان ہے کہ عمرو بن لُحی کسی کام سے مکہ سے شام گیا۔ یہ اس زمانہ میں رئیسِ مکہ اور متولی کعبہ تھا۔ اس نے وہاں قوم عمالقہ کو

بت پرستی کرتے دیکھا تو متعجب ہو کر پوچھا کہ تم یہ کیا کر رہے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ "ھٰذہٖ اصنام نعبدھا، فنستمطرھا فتمطرنا ونستنصرھا فتنصرنا" یعنی یہ بت ہیں جن کی ہم پرستش کرتے ہیں۔ جب ہم ان سے بارش طلب کرتے ہیں تو یہ ہمیں بارش سے مستفید کرتے ہیں اور جب ہم امداد مانگتے ہیں تو یہ ہماری امداد کرتے ہیں۔ (سیرۃ الحلبیۃ، جلد ۱ ص ۱۱، سیرۃ ابن ہشام، جلد ۱، ص ۸۱) لیکن جناب عبدالمطلب نے اس موقع پر نہ قولاً اس عقیدہ کا اظہار کیا اور نہ عملاً بتوں کی طرف رجوع کر کے اُس کا خطاب کیا بلکہ اُنھوں نے براہ راست خدائے برتر واعلیٰ سے طلب باراں کی دُعا کی جو اُن کی توحید پرستی کی بیّن دلیل ہے۔

جناب عبدالمطلب کی زندگی کے یہ چند واقعات ہیں جن سے صاحب سیرۃ الحلبیۃ کے اس قول کی پوری طرح تردید ہو جاتی ہے کہ انھوں نے آخر عمر میں بت پرستی کو ترک کر کے توحید پرستی اختیار کر لی تھی۔ درحقیقت حضرت عبدالمطلب اپنی پوری زندگی بھر شمع توحید کے پروانے بن کر رہے۔

جناب عبدالمطلب کے موحّد ہونے پر قوی ترین اور قاطع دلیل

جناب عبدالمطلب کے موحد ہونے کے ثبوت میں جو واقعات ہم نے اوپر بیان کئے ہیں وہ کم و بیش تمام معتبر کتب سیَر و تواریخ میں منقول ہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ ان واقعات کے استناد میں کسی کو اعتراض ہو۔ اس لئے اب ہم اُن کے موحّد ہونے کے ثبوت میں وہ شہادت پیش کرتے ہیں جس میں کسی کو

کلام ہی نہیں ہو سکتا۔

یہ حقیقت سب کو معلوم ہے کہ عرب میں زمانۂ قبل اسلام کو زمانۂ جاہلیت کہتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں دین حنیفیہ یعنی دین ابراہیمی قریب قریب نسیاً منسیا ہو چکا تھا اور پورا جزیرہ نمائے عرب کفر و شرک کی آغوش میں پہونچ چکا تھا۔ امام بیضاوی آیۂ کریمہ "وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الجاهلیۃِ الاُولیٰ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں: قیل جاھلیۃ الاولیٰ جاھلیۃ الکفر والجاھلیۃ الاخریٰ جاھلیۃ الفسوق فی الاسلام" یعنی بیان کیا جاتا ہے کہ جاہلیت اولیٰ سے اسلام سے پہلے کا وہ زمانہ مراد ہے جس میں لوگ کفر و شرک میں مبتلا تھے اور جاہلیت اُخریٰ سے عہد اسلام میں وہ زمانہ مراد ہے جس میں لوگ فسق و فجور میں مبتلا ہوں۔" (تفسیر بیضاوی، جلد ۲، ص ۱۹۴)۔

اب یہ تاریخ اسلام کا ایک مسلّمہ واقعہ ہے کہ جب ۸ھ ہجری میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے مکّہ فتح کیا تو آپ نے خانۂ کعبہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر ایک نہایت فصیح و بلیغ اور یادگار خطبہ ارشاد فرمایا جس میں منجملہ دیگر امور کے آپ نے مسلمانوں سے یہ بھی کہا:

"یا معشر قریش! ان اللہ اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیۃ وتعظمھا بالآباءِ والناس من آدم من تراب" یعنی اے گروہ قریش! بہ تحقیق اللہ نے تم سے جاہلیت کے غرور اور آباء و اجداد جاہلیت پر فخر و مباہات کو ختم کر دیا۔ تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹّی سے

پیدا ہوئے (سیرۃ الحلبیۃ، جلد ۲، ص ۲۲۲) امام بیضاوی کے مذکورہ بالا قول کی روشنی میں کہ جاہلیت اُولیٰ سے اسلام سے پہلے کا وہ زمانہ مراد ہے جس میں لوگ کفر و شرک میں ملوث تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبے کے مذکورہ صدر فقرہ کا یہ مطلب ہے کہ خداوند عالم نے زمانۂ جاہلیت کے اُن آباء و اجداد پر جو کافر تھے فخر و مباہات کرنے سے منع فرمادیا ہے۔ اس خطبہ کو دیئے ہوئے ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے کہ غزوۂ حنین پیش آیا۔ تمام تاریخیں اس پر متفق ہیں کہ جب اس غزوہ میں لشکر اسلام نے روبفرار کیا اور پیغمبر اسلام محض چار پانچ آدمیوں کے ساتھ میدان جنگ میں رہ گئے تو آپ گھوڑے پر سوار، نیزہ ہاتھ میں لئے برابر بہ فخر و مباہات یہ رجز پڑھ رہے تھے۔

انا النبیّ لاکذب - انا ابنُ عبدِ المطلب

میں نبی ہوں۔ جھوٹا نہیں ہوں، میں عبدالمطلب کی اولاد ہوں

اگر جناب عبدالمطلب اپنی طویل عمر کے کسی حصہ میں کافر رہے ہوتے تو جناب رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام بآواز بلند میدان حنین میں ابنیت عبدالمطلب پر فخر و مباہات نہ کرتے کیونکہ اس جنگ میں کم و بیش وہ تمام لوگ موجود تھے جنہوں نے فتح مکہ کے موقع پر آپ کا مذکورہ صدر خطبہ سُنا تھا۔ وہ آپ سے کہہ سکتے تھے کہ کل ہی تو آپ نے فرمایا تھا کہ عہد جاہلیت کے آباء و اجداد پر فخر کرنے سے خداوند کریم نے منع فرمادیا ہے اور آج آپ خود ہی اپنے کافر دادا پر فخر و مباہات

کر رہے ہیں۔ لیکن تاریخیں کسی ایسے شخص کی نشاندہی نہیں کرتیں جس نے آپ پر یہ اعتراض کیا ہو۔ یہ جناب عبدالمطلب کے مدۃ العمر موحد ہونے کی قوی ترین اور قاطع دلیل ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے بھی جناب عبدالمطلب کے موحّد ہونے پر اس دلیل کو قوی ترین دلیل قرار دیا ہے، چنانچہ وہ رسالہ "مسالک الحنفاء" میں لکھتے ہیں:

"وینضم الیٰ ذٰلک اَنَّ النبیَّ صلّے اللہ علیہ وآلہ وسلّم انتسب الیہ یومَ حُنینٍ، فقال:

انا النبی لا کذِب — انا ابنُ عبد المطلب

وھذا اقویٰ مایقویٰ بہ مقالۃ الامام فخر الدین ومن وافقہ لِاَنَّ الاحادیث وردت فی النھی عن الانتساب الی الآباء الکفار"

(ترجمہ): (حضرت عبدالمطلب کے موحّد ہونے پر) یہ دلیل بھی قابل اضافہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے غزوۂ حُنین کے دن اُن سے اپنے نسب اور رشتہ کا اظہار کیا چنانچہ اُس روز آپ فرما رہے تھے:

میں نبی ہوں جھوٹا نہیں ہوں۔ میں عبدالمطلب کی اولاد ہوں

اور یہ امام فخر الدین رازی اور اُن کی رائے سے اتفاق رکھنے والے علماء کے قول کی (کہ عبدالمطلب مسلک توحید پر گامزن تھے) قوی ترین دلیل ہے کیونکہ ایسی بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں جن میں

کافر آباء و اجداد کی طرف انتساب سے منع کیا گیا ہے۔ (الرسائل التسع رسالہ مسالک الحنفاء، ص ۴۱-۴۲)

جناب عبدالمطلب کے پیرو دین ابراہیم ہونے پر دلیل

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ سرزمین عرب میں جناب اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد سے پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام تک کوئی نبی یا رسول مبعوث نہیں ہوا۔ جناب اسمٰعیل نے عرب میں دین ابراہیمی کی تبلیغ و ترویج کی۔ چونکہ عہد حضرت اسمٰعیل اور زمانۂ جناب رسالت مآب کا درمیانی عرصہ بہت طویل تھا اس لئے دین ابراہیمی کے بہت سے اصول اس مدّت میں تغیرات کا شکار ہو گئے۔ بعض اُصول بالکل نسیاً منسیاً ہو کر رہ گئے۔ بعض تغیر پذیر ہو گئے جیسے طواف خانۂ کعبہ کہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں لوگ ملبوس ہو کر طواف کیا کرتے تھے لیکن ایام جاہلیت میں وہ برہنہ ہو کر طواف کرنے لگے۔ یا حضرت ابراہیمؑ کی شریعت میں محرم عورتوں سے نکاح جائز نہیں تھا لیکن عہد جاہلیت میں لوگ اُن سے نکاح کر لیتے تھے۔ یا پھر ملّت ابراہیمی میں شراب اور زنا دونوں چیزیں حرام تھیں لیکن زمانۂ جاہلیت میں ان کو جائز سمجھا جانے لگا تھا اور زنا کا ارتکاب اتنا کھلّم کھلّا ہونے لگا تھا کہ فاحشہ عورتیں اپنے گھروں پر جھنڈے نصب کر کے لوگوں کو زناکاری کی دعوت دیتی تھیں۔ پھر بعض رسمیں دین ابراہیمی میں داخل کر دی گئی تھیں حالانکہ اُن کا دین ابراہیمی سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا

جیسے کسی کے گھر لڑکی پیدا ہونے پر اُس کو زندہ دفنا دینا۔ جناب عبد المطلب نے نہایت ہمت اور پامردی سے ان تمام بدعات سے دین ابراہیمی کی تطہیر کا بیڑہ اُٹھایا اور بڑی حد تک اس جدوجہد میں کامیابی حاصل کی۔ جناب عبد المطلب کی یہ اصلاحات تاریخ میں ضوابط مطلبی کے نام سے مشہور ہیں۔ علامہ عبد اللہ العمادی نے اپنی کتاب تاریخ اسلام میں لکھا ہے کہ ضوابط مطلبی یہ تھے :۔

(۱) وفائے نذر (۲) دیت یعنی خون بہا میں ایک سو اونٹ (۳) جو عورتیں محرم ہوں اُن کے ساتھ نکاح نہیں ہو سکتا (۴) گھروں میں پیچھے سے نہ آئیں، دروازے سے داخل ہوں (۵) چور کے ہاتھ کاٹ دئیے جائیں (۶) موؤدہ یعنی لڑکی پیدا ہونے پر اُس کو قتل نہ کریں (۷) مُباہلہ (۸) شراب حرام ہے۔ (۹) زنا حرام ہے (۱۰) حدّ زنا یعنی اُس کی سزا (۱۱) قرعہ اندازی (۱۲) برہنہ ہو کر خانۂ کعبہ کا طواف کوئی نہ کرے (۱۳) مہمان کی میزبانی (۱۴) حج میں صرف پاک کمائی خرچ ہو (۱۵) تعظیم شہور یعنی سال کے چار مہینے قابل تعظیم ہیں، اُن میں فتنہ وفساد اور جنگ وقتال نہ ہونے پائے (۱۶) جھنڈے والیاں مکہ معظمہ میں نہ رہنے پائیں۔

جناب عبد المطلب نے یہ اصلاحات اس قدر غور وفکر کر کے نافذ کی تھیں کہ اُن کے متعلق تاریخ میں یہ الفاظ ملتے ہیں :۔

"وتوترت عنہ سُنَنٌ جاءَ القرآن باکثرھا وجاءت السُّنۃ بھا"

(سیرۃ الحلبیہ جلد ۱، ص ۴) (ترجمہ) یعنی جناب عبد المطلب سے ایسے قواعد منقول ہیں جن میں سے اکثر کو قرآن نے بحال رکھا اور کچھ کو سنت نبوی نے۔

الغرض جو شعائر دین ابراہیمی علیٰ حالہ رائج تھے اور جو اصلاحات جناب عبد المطلب نے نافذ کی تھیں اُن پر وہ اس قدر سختی سے پابند تھے کہ قریش کہا کرتے تھے کہ عبد المطلب ابراہیم ثانی ہیں (تاریخ اسلام للعلامہ عبد اللہ العمادی سابق صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ، مطبوعہ مطبع رزاقی کراچی، ص ۱۷-۱۸)

علامہ سیوطی نے بھی حضرت عبد المطلب کے ملت ابراہیمی کے پیرو ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ اس سلسلہ میں جو دلیل انھوں نے پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ "ابن سعد نے طبقات میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ جب ابرہہ حاکم یمن نے خانۂ کعبہ کے منہدم کرنے کے لئے مکہ معظمہ پر لشکر کشی کی تو عبد المطلب کوہ ابو قبیس پر چڑھ گئے اور اس طرح دُعا کرنے لگے:۔

لاھُمَّ اِنَّ المرءَ یمنع — رحلہ فامنع رحالک
لایَغلبنَّ صلیبھم — ومحالھم ابداً محالک

اور ایک گروہ علماء نے اس آخری شعر کو اس طرح نقل کیا ہے

فانصُر علیٰ آل الصلیب — وعابدیہ الیوم آلک

(ترجمہ): اے اللہ! آج صلیب کے ماننے والوں اور اس کے پرستاروں

کے مقابلہ میں تو اپنے ماننے والوں کی مدد فرمانا۔

اس کے بعد علامہ سیوطی لکھتے ہیں:۔

"هذا أيدلُّ على انّه كان على الحنيفية حيث تبرّأ من الصليب وعابديه"۔ یعنی یہ شعر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عبد المطلب دین حنیفیہ کے پیرو تھے کیونکہ انہوں نے صاف طور سے صلیب اور اس کے پرستاروں سے بے تعلقی کا اظہار کیا ہے۔ (الرسائل التسع للسیوطی، رسالۂ التعظیم والمنۃ، ص ۵۲)

بس یہ اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ جناب عبد المطلب پیرو دین ابراہیم تھے۔

جناب عبد المطلب معاد اور جزاء و سزائے آخرت کے قائل تھے

جناب عبد المطلب کے معاد اور جزاء و سزائے آخرت کے قائل ہونے پر تاریخ میں متعدد شہادتیں ملتی ہیں۔ ہم بخوف طوالت اس سلسلہ میں صرف دو شہادتیں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

(۱) علامہ شہرستانی ملل و نحل میں لکھتے ہیں کہ جب حضرت عبد اللہ اور اونٹوں پر قرعہ اندازی کی جا رہی تھی اُس وقت عبد المطلب خدا سے رجوع کئے ہوئے یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

یا ربّ انت الملیک المحمُود
وانت ربی المبدی والمعید
من عندک الطّارفُ والتّلیدُ

(ترجمہ): اے پروردگار! تو ہی صاحب قدرت و اقتدار ہے اور تو ہی

قابل حمد و ستائش ہے۔ تو ہی میرا پالنے والا ہے۔ تو ہی ابتدائے عالم وجود میں لانے والا ہے اور تو ہی مرنے کے بعد پھر حیات نو عطا کرنے والا ہے نئی اور پرانی سب چیزوں کا وجود تیرا ہی مرہونِ منت ہے۔ (الملل والنحل، جلد ۲، صفحہ ۲۴۷)

شہرستانی لکھتے ہیں کہ یہ اشعار آپ کے مبدأ و معاد کے قائل ہونے کا بیّن ثبوت ہیں۔

(۲) پھر اسی "الملل والنحل" میں علامہ شہرستانی لکھتے ہیں۔

"عبدالمطلب اپنی اولاد کو یہ وصیت کیا کرتے تھے کہ کوئی ظالم دنیا سے نہیں جا سکتا جب تک کہ اللہ اس سے اس کے ظلم کا انتقام نہ لے لے اور اس کو اس کی سزا نہ دیدے۔ اتفاق یہ کہ شام میں ایک ظالم شخص اس حالت میں مر گیا کہ اس کو اس کے ظلموں کی کوئی سزا نہیں ملی۔ یہ واقعہ عبدالمطلب سے بیان کیا گیا تو انہوں نے غور و فکر کرنے کے بعد کہا: اللہ کی قسم! اس دنیا کے علاوہ ایک اور گھر بھی ہے جہاں اس دنیا کے اچھے کام کرنے والوں کو اچھا بدلہ اور برے کام کرنے والوں کو برا بدلہ ملے گا۔ (الملل والنحل، جلد ۲، ص ۲۳۹-۲۴۰)

پس یہ چیز بخوبی ثابت ہے کہ جناب عبدالمطلب موحّد، ملّت ابراہیمی کے پیرو اور معاد و جزا و سزائے اعمال کے قائل تھے۔

دین ابراہیمی کے یہی بنیادی اصول تھے اور ان ہی پر نجات کا دار و مدار تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم بھی قبل نبوت دین ابراہیمی

پر ہی عمل پیرا تھے۔ چنانچہ صاحب سیرۃ الحلبیہ لکھتے ہیں:۔

وفی کلام الشیخ محی الدین بن العربی: تعبّد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم قبل بنوتہ بشریعۃ ابراھیم حتّٰی فجاءہ الوحی وجاءتہ الرسالۃ"

(ترجمہ): شیخ محی الدین ابن العربی کہتے ہیں کہ نبوت سے پہلے پیغمبر اسلام شریعت ابراہیمی پر چلتے تھے یہاں تک کہ اچانک آپ پر وحی نازل ہوئی اور آپ کو منصب رسالت ملا۔ (سیرۃ الحلبیہ، جلد ۱، ص ۲۲۷)

پس جس طرح کوئی کلمہ گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ملّت ابراہیمی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ قبل نبوت مشرک تھے اسی طرح حضرت عبدالمطلب کے متعلق بھی مذکورہ بالا شواہد کی موجودگی میں وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ مشرک تھے، ہاں یہ دوسری بات ہے کہ وہ موضوع روایات کے اطواق و سلاسل میں اتنا جکڑا ہوا ہو کہ اُس سے غور و فکر کی آزادی ہی سلب ہو گئی ہو۔

جناب عبدالمطلب اسی معنی میں مسلمان تھے کہ جس معنی میں دین محمدی میں مسلمان ہوتے ہیں

تاریخ کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب عبدالمطلب اُسی معنیٰ میں مسلم بھی تھے کہ جس معنی میں قبل ہجرت دین محمدی میں مسلمان کا

مفہوم سمجھا جاتا تھا۔ ہجرت سے پہلے دین ابراہیمی اور دین محمدی میں صرف اتنا فرق تھا کہ دین محمدی کے ماننے والے کو حضور صلعم کی نبوت پر بھی ایمان لانا ضروری تھا۔ جناب عبدالمطلب کی یہ خصوصیت نظر آتی ہے کہ دعوت دین محمدی کے وقت آنے سے پہلے ہی آپ آنحضرت صلعم کی نبوت پر ایمان رکھتے تھے۔ اس حقیقت کے ثبوت میں منجملہ متعدد واقعات کے ہم صرف دو واقعات ہدیۂ قارئین کرتے ہیں۔ علامہ سیوطی اپنے رسالے "التعظیم والمنۃ" میں لکھتے ہیں:۔

(۱) "علامہ ابن سعد اپنی کتاب طبقات الکبریٰ میں باسناد تحریر کرتے ہیں کہ ایک روز عبدالمطلب نے اُمِّ ایمن سے جو بچپن میں رسول اللہ صلعم کی دیکھ بھال پر مامور تھی، کہا: اے برکت! میرے اس فرزند سے غفلت نہ برتنا کیونکہ میں نے اہل کتاب کو مکرر یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ میرا یہ نور نظر اس ملت کا نبی ہے" (الرسائل التسع للسیوطی، رسالہ التعظیم والمنۃ، ص ۲۷)

(۲) علامہ عبداللہ العمادی اپنی تاریخ اسلام میں لکھتے ہیں۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیس برس کے ہوئے تو نبوت کی علامتیں آپ سے نمایاں ہونے لگیں۔ اہل کتاب آپ کے باب میں قیل وقال کرنے لگے۔ آپ کا تذکرہ کیا کرتے، وصف احوال کرتے اور قرب ظہور کی خبر دیتے۔ حضرتؑ نے ایک مرتبہ ابوطالب سے فرمایا۔ اے میرے چچا! میں خواب میں ایک شخص کو اپنے پاس آتے دیکھتا

ہوں۔ دو شخص اُس کے ساتھ اور ہوتے ہیں جو کہتے ہیں "یہ وہی ہے یہ وہی ہے، جب وہاں تک پہونچے تو اس سے کام لینا" وہ پہلا شخص خاموش رہتا ہے۔ مکّہ میں ایک صاحب علم سے ابو طالب نے یہ کیفیت بیان کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کے وہ بول اٹھا کہ "یہ روح پاک ہے۔ یہ واللہ نبی مطہّر ہے"۔ ابو طالب نے اُس سے کہا: "ایسا ہے تو میرے بھتیجے سے اس کو مخفی رکھو۔ قوم کو اُس کے خلاف برانگیختہ نہ ہونے دو۔ میرے والد عبد المطلب نے مجھے خبر دی تھی کہ یہی نبیّ مبعوث ہے۔ اور مجھے حکم دیا تھا کہ اس کو چھپائے رہوں کہ دشمن اُس کے خلاف برانگیختہ نہ ہوں"۔ (تاریخ اسلام للعلامہ عبد اللہ العمادی ص ۲۴)

ان واقعات سے بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ جناب عبد المطلب مُوحّد، پیرو دین ابراہیمی، اور معاد و جزا و سزائے اعمال کے قائل ہونے کے ساتھ ساتھ آنحضرت ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت پر بھی ایمان رکھتے تھے اور اس طرح وہ مومن و مُسلم تھے اور یہیں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ آنحضرت صلعم کی بعثت کے وقت بقید حیات ہوتے تو اُنہیں اسلام لانے کی ضرورت نہ ہوتی کیونکہ وہ تو پہلے سے ہی موحد تھے اور نبوت محمدی پر ایمان رکھتے تھے۔

یہاں ایک اعتراض پیدا ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چالیس سال کی عمر میں مبعوث ہوئے اور مبعوث ہونے کے بعد آپ کو دعوت دین دینے پر مامور کیا گیا۔ عبد المطلب کا

انتقال اُس وقت ہوا کہ جب آپ کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی۔ کیا دعوت دین دینے سے پہلے کسی شخص کا آپ کی نبوت پر ایمان رکھنا اُس کو مسلمان بنا سکتا ہے اور کیا یہ ایمان اُس کی نجات کے لئے کافی ہو سکتا ہے؟

غور و فکر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو شخص ایسے وقت میں بھی حضور صلعم کی نبوت کا مقر ہوا کہ جب آپ دعوت دین دینے پر مامور نہیں ہوئے تھے وہ بھی مسلمانوں کے زمرہ میں داخل ہوگا اور یہ ایمان و اقرار بھی اُس کی نجات اور اُس کے مستحق جنت ہونے کے لئے معتبر ہوگا۔ ہم اس نتیجہ کی تائید میں ایک تاریخی شہادت پیش کرتے ہیں۔ اس پر جمہور علمائے اسلام کا اتفاق ہے کہ سب سے پہلے جو وحی حضور صلعم پر نازل ہوئی وہ سورۂ علق کی ابتدائی آیات یعنی اقرأ باسم ربك الذی خلق سے علم الانسان مالم یعلم تھیں۔ اس موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو کیفیت طاری ہوئی اُس کا تذکرہ آپ نے اپنی زوجہ خدیجہ سے کیا۔ وہ آپ کو اپنے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو ضعیف العمر اور نابینا تھے اور نصرانی مذہب کے عالم تھے اور اسی وجہ سے اُن کا لقب "قس" مشہور تھا۔ ورقہ نے آنحضرت صلعم سے نزول وحی کے تمام واقعات سن کر کہا کہ "جو شخص آپ پر نازل ہوا وہ ناموس تھا کہ جو جبرئیل پر نازل ہوا تھا۔ اے محمد! آپ کو بشارت ہو کہ آپ خدا کے رسول ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ وہی پیغمبر ہیں کہ جس کی جناب حضرت عیسیٰ نے بشارت

دی تھی کہ میرے بعد ایک نبی مبعوث ہو گا جس کا نام احمد ہو گا۔ وہ وقت دور نہیں کہ جب آپ کفّار سے جہاد پر مامور ہوں گے۔ کاش میں اُس زمانہ میں زندہ ہوتا اور جوان و توانا ہوتا کہ جب آپ کی قوم آپ کو آپ کے وطن سے نکالے گی۔ اگر مجھے وہ زمانہ نصیب ہوا تو میں آپ کی پوری پوری مدد کروں گا۔ اس کے کچھ ہی دن بعد ورقہ مرگیا اور اُس کو وہ وقت نصیب نہیں ہوا کہ جب پیغمبر اسلام دعوت دین دینے پر مامور ہوئے"

(مدارج النبوۃ للشیخ عبد الحق محدث دہلوی، جلد ۲، ص ۴۵)

اس اقتباس سے بخوبی ثابت ہے کہ ورقہ بن نوفل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر آپ کے دعوت دین پر مامور ہونے سے پہلے ایمان لائے تھے۔ ان کے متعلق صاحب روضۃ الاحباب یہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے قس کو جنت میں اس حال میں دیکھا کہ وہ سبز لباس پہنے ہوئے ہے اور یہ مقام اُس کو اس لئے ملا کہ وہ مجھ پر ایمان لے آیا تھا اور مجھ کو سچا نبی جانتا تھا۔

(روضۃ الاحباب جلد ۱، ص ۷)۔ علامہ طبرسی نے بھی اپنی تفسیر مجمع البیان میں سورۂ علق کی تفسیر کے ذیل میں اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

(تفسیر مجمع البیان، جلد ۵، ص ۵۱۴)

پس یہ بخوبی ثابت ہو گیا کہ مومن و مسلمان ہونے اور نجات کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ کوئی شخص موحّد ہوتے ہوئے اس زمانہ میں پیغمبر پر ایمان لائے کہ جب آپ دعوت دین دینے پر مامور ہوئے۔ لفظ

صحابی کی تعریف سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے۔ صحابی کی تعریف یہ ہے کہ ہر وہ شخص صحابی ہے جس نے آنحضرت صلعم سے ایمان کی حالت میں ملاقات کی اور ایمان کی حالت پر ہی اُس کا خاتمہ ہوا ہو۔ (نُخبۃ الفکر لابن حجر عسقلانی، ص ۸۱، مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی)۔ اس تعریف میں علماء نے جو یہ شق نکالی ہے کہ ملاقات وہ معتبر ہے جو ظہور دعوت دین کے وقت ہوئی ہو یہ خود علامہ ابن حجر کے نزدیک محلِ نظر ہے۔ (نُخبۃ الفکر، ص ۸۲)۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء، مثل ابن مندہ اور ابو نعیم نے ورقہ بن نوفل کو اور زید بن عمرو بن نفیل اور بحیرا راہب کو جو ورقہ کی طرح ظہور دعوت سے پہلے حضور صلعم پر ایمان لے آئے تھے صحابہ کی فہرست میں شمار کیا ہے۔

اُن احادیث پر نقد و تبصرہ جو حضرت عبد المطلب کے مشرک ہونے پر دلالت کرتی ہیں

اب ہم اُن احادیث کی صحت و سقم کا جائزہ لیں گے جو جناب عبد المطلب کے مشرک ہونے اور حالتِ شرک میں مرنے پر دلالت کرتی ہیں۔

حدیث اوّل حدیث احتضار ابو طالب

چونکہ کتب احادیث میں صحیحین یعنی صحیح بخاری

اور صحیح مسلم کا مقام بہت بلند سمجھا جاتا ہے اس لئے ہم حدیث احتضار جناب ابوطالب کو ان ہی دو کتابوں سے نقل کریں گے اور پھر ان پر نقد و تبصرہ کریں گے۔

احادیث مندرجہ صحیح بخاری

(۱) امام بخاری کہتے ہیں: ہم سے اسحٰق نے، اُن سے یعقوب بن ابراہیم نے، اُن سے اُبی نے، اُن سے صالح نے، اُن سے ابن شہاب زہری نے، اُن سے سعید ابن مُسیب نے اور اُن سے اُن کے والد مُسیّب نے بیان کیا کہ جب ابوطالب کی وفات قریب ہوئی تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کے پاس تشریف لائے۔ پس آپ نے اُن کے پاس ابوجہل بن ہشام اور عبداللہ ابن ابی اُمیّہ کو پایا۔ رسول صلعم نے ابوطالب سے فرمایا کہ " اے چچا، لاالہ الااللہ کہدو، میں تمہارے لئے اللہ کے ہاں اس کی گواہی دوں گا۔ ابوجہل اور عبداللہ ابن ابی اُمیّہ نے کہا: اے ابوطالب! کیا تم عبدالمطلب کے طریق سے پھرے جاتے ہو۔ پھر رسول خدا متواتر کلمہ شریف پر اُن کو دعوت دیتے رہے اور وہ دونوں وہی بات کہتے رہے۔ یہاں تک کہ ابوطالب نے سب سے آخر گفتگو جو اُن سے کی اُس میں کہا کہ وہ عبدالمطلب کے طریقے پر ہیں اور انہوں نے لاالہ الااللہ کہنے سے انکار کر دیا۔ (پھر وہ مر گئے) تو رسول خدا نے فرمایا کہ: ہاں میں تمہارے لئے استغفار کروں گا جب تک کہ مجھے اس سے

ممانعت نہ کی جائے۔ (چنانچہ آپ استغفار کرنے لگے) جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: "ما کان للنبی والذین امنوا ان یستغفروا للمشرکین الخ یعنی نبیؐ اور مسلمانوں کو یہ اختیار نہیں کہ وہ مشرکوں کے لئے استغفار کریں۔ (سورۂ توبہ آیت ۱۱۳) (سند صحیح بخاری عربی سے لی گئی ہے اور ترجمۂ حدیث مرزا حیرت دہلوی کی مترجم صحیح بخاری سے نقل کیا گیا ہے۔ صحیح بخاری جلد ۱، ص ۳۰۳، پارہ ۵، کتاب الجنائز، حدیث نمبر ۱۲۵۹)

(۲)۔(۳)۔ بالکل یہی روایت امام بخاری نے صحیح بخاری جلد ۲ ص ۲۶۸، پارہ ۱۵، حدیث ۱۰۵۹ اور جلد ۲ ص ۴۹۱۔۴۹۲، پارہ ۱۹، کتاب التفسیر، حدیث نمبر ۷۷ا میں درج کی ہے۔ ان احادیث کی سند میں ابتدائی راوی مختلف ہیں لیکن آخر میں وہی زہری سعید ابن المسیّب سے اور سعید ابن المسیّب اپنے باپ مسیّب سے روایت کرتے ہیں۔

احادیث مندرجہ صحیح مسلم

امام مسلم کہتے ہیں: مجھ سے حرملہ بن یحیی التیجبی نے، اُن سے عبداللہ بن وھب نے، اُن سے یونس نے، اُن سے ابن شہاب زہری نے، اُن سے سعید بن المسیّب نے اور اُن سے مسیّب نے بیان کیا کہ جب ابوطالب کا وقت وفات آیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس آئے اور

ابوجہل اور عبداللہ بن ابی اُمیہ بن مغیرہ کو اُن کے پاس موجود پایا۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: اے چچا کلمۂ لا الہ الا اللہ کہہ دیجیے۔ اس کے ذریعہ میں خدا کے سامنے آپ کے حق میں گواہی دوں گا۔ اس پر ابوجہل اور عبداللہ بن ابی اُمیہ نے کہا: اے ابوطالب! کیا تم عبدالمطلب کے طریقہ سے انحراف کروگے؟ رسول اللہ صلعم جناب ابوطالب کو برابر یہ دعوت دیتے رہے اور اپنے قول کا اعادہ کرتے رہے یہاں تک کہ جو آخر بات ابوطالب نے کہی وہ یہ تھی کہ وہ عبدالمطلب کے طریقے پر (قائم) ہیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خیر، خدا کی قسم میں آپ کے لئے دعائے مغفرت کرتا رہوں گا جب تک کہ مجھے اس سے منع نہ کردیا جائے۔ پس اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: ماکان للنبی والذین اٰمنوا الخ اور اللہ نے ابوطالب کے بارے میں یہ آیت بھی نازل کی "اِنّک لا تھدی من احببت الخ"۔ (صحیح مسلم جلد ۱، ص ۴۱، مطبوعہ مطبع الحلبی، مصر)

ان احادیث بخاری کو نقل کرنے کے بعد علامہ سیوطی اپنے رسالہ مسالک الحنفاء میں لکھتے ہیں:۔

"وظاھر ھذا الحدیث یقضی انّ عبد المطلب مات علی الشرک"

یعنی بظاہر اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبدالمطلب نے بہ حالتِ شرک اس دنیا سے رحلت کی۔

(الرسائل التسع للسیوطی، رسالۂ مسالک الحنفاء، ص ۴۰)۔

مذکورہ بالا احادیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے یہ چیز صاف ظاہر ہے کہ جو واقعہ ان میں درج ہے وہ اُس وقت کا ہے جب جناب ابوطالب پر سکرات موت کا عالم طاری تھا اور اسی وجہ سے اس حدیث کو احتضار کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

حدیث اِحتضار پر اصولِ روایت کی بناء پر نقد و تبصرہ

احادیث مذکورہ بالا میں ایک چیز بطور قدر مشترک نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان سب میں آخری راوی سعید ابن المسیب تابعی کے والد مُسیّب ہیں جو صحابی رسول ہیں لیکن بقول صاحب استیعاب یہ بیعۃ الرضوان کے موقع پر ۶ھ ہجری میں مسلمان ہوئے (استیعاب جلد ۱، ص ۲۶۹) اور بقول صاحب اصابہ انہوں نے فتح مکہ کے موقع پر ۸ھ ہجری میں اسلام قبول کیا۔ (اصابہ جلد ۳، ص ۴۰۳)۔ جناب ابوطالب کا انتقال مورخین کے متفقہ قول کے مطابق ۱۰ بعثت یعنی ہجرت سے تین سال قبل ہوا۔ گویا مُسیّب کے مشرف بہ اسلام ہونے سے قریب دس سال پہلے ابوطالب کی وفات ہو چکی تھی۔ اس لئے جناب ابوطالب کے احتضار کے وقت مُسیّب کا موجود ہونا ثابت نہیں ہوتا خاص کر ایسی صورت میں کہ جب نہ تو مُسیّب نے کسی حدیث میں اس بات کا ذکر کیا کہ وفات ابوطالب کے وقت وہ موجود تھے اور نہ کسی ایسے شخص کا نام بتلایا جو اس واقعہ کا شاہد عینی ہو اور اُس سے اُنہوں نے یہ واقعہ سُنا ہو۔ ایسی صورت میں مُسیّب والی تمام احادیث جو

اوپر درج کی گئی ہیں مُرسل قرار پاتی ہیں اور اس لیئے بقول علامہ شبلی جو واقعہ اُن میں بیان ہوا ہے اُس پر حجت نہیں ہوسکتیں۔ مناسب ہوگا اگر ہم علامہ شبلی کے افادات خود اُن کی کتاب سے نقل کردیں۔ وہ "سیرۃ النبی" میں لکھتے ہیں:۔

"ابو طالب کے اسلام کے متعلق اختلاف ہے لیکن چونکہ بخاری کی روایت عموماً صحیح تر مانی جاتی ہے اس لیئے محدثین زیادہ تر اُن کے کفر کے ہی قائل ہیں لیکن محدّثانہ حیثیت سے بخاری کی یہ روایت چنداں قابل حُجت نہیں کیونکہ اخیر راوی مُسیّب ہیں جو فتح مکہ میں اسلام لائے اور ابو طالب کی وفات کے وقت موجود نہ تھے۔ اسی بناء پر علامہ عینی (مصنّف عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری) نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ یہ روایت مُرسل ہے" (سیرۃ النبی، جلد ۱، ص ۱۸۲)۔

پس اُصول روایت کی بناء پر حدیث اِحتضار قابل حجت نہیں اور اس سے نہ جناب ابو طالب کا حالت شرک میں مرنا ثابت ہوتا ہے اور نہ اُن کے والد حضرت عبد المطلب کا

حدیث احتضار پر اُصول درایت کی بناء پر تبصرہ

جب ہم اُصول درایت کی کسوٹی پر اس حدیث کو کس کر دیکھتے ہیں تو معاملہ اسی حد پر ختم نہیں ہوتا کہ یہ ناقابل حجت ہے بلکہ یہ حدیث صاف طور سے موضوع قرار پاتی ہے۔ محدثین نے چند علامات وضع حدیث

بتلائی ہیں جن کی روشنی میں متنِ حدیث پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ حدیث موضوع ہے۔ ان علامات کو مُلّا علی قاری نے موضوعات کبیر میں، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے عجالۂ نافعہ میں اور علامہ شبلی نے اپنی کتاب سیرۃ النبی جلد اوّل میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

(۱) ملا علی قاری "موضوعات کبیر میں لکھتے ہیں کہ "حدیث کے موضوع ہونے کی علامات میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ یہ حدیث باطل ہے" (موضوعات کبیر مع اردو ترجمہ، ص ۵۴، مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی)۔ قرائن پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سورۂ توبہ کا نزول ۹ھ ہجری میں غزوہ تبوک میں اور تبوک سے واپس ہوتے ہوئے ہوا جب آپ نے حج کا ارادہ کیا اور معلوم ہوا کہ مشرکین اپنے عہد کے خلاف برہنگی کی حالت میں طواف کریں گے اور آپ نے سورۂ توبہ یعنی سورۂ براۃ کی تبلیغ کا انتظام فرمایا۔ جناب ابوطالب کا انتقال ہجرت سے تین سال قبل ہوا۔ پس معلوم ہوا کہ آیۂ کریمہ "ما کان للنبی و الذین اٰمنوا الخ" جو سورۂ توبہ یا برأت کی آیت ہے جناب ابوطالب کی وفات سے قریب بارہ سال بعد نازل ہوئی۔ اس لئے اس آیت کا وفات ابوطالب کے مزعومہ واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا اور حدیث زیر بحث جو واقعہ وفات ابوطالب کو اس آیت کے نزول سے متعلق کرتی ہے قطعی موضوع قرار پاتی ہے۔ امام واحدی نے بھی اپنی تفسیر میں اس دلیل کو پیش کیا ہے، چنانچہ تفسیر کبیر میں ہے:۔

قال الواحدی: وقد استبعدہ الحسین بن فضل لان ھٰذہ السورۃ من آخر القرآن نزولاً ووفاۃ ابی طالب کانت بمکۃ فی اول الاسلام (تفسیر کبیر للرازی، جلد ۱۶ص ۲۱۱)

امام واحدی کہتے ہیں کہ اس آیہ کریمہ (ما کان للنبی الخ کے وقت وفات ابوطالب نازل ہونے) کو حسین بن فضل نے بعید سمجھا ہے کیونکہ سورۂ توبہ (جس کی یہ ایک آیت ہے) نزول کے اعتبار سے قرآن کا آخری سورہ ہے اور ابوطالب کی وفات ابتدائے اسلام میں مکہ ہی میں ہو گئی تھی

ممکن ہے اس منزل پر کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ جب یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ مکّی سورتوں میں مدنی آیتیں اور مدنی سورتوں میں مکی آیتیں شامل ہیں تو ہو سکتا ہے کہ گو سورۂ توبہ مدنی ہے لیکن اس میں آیۂ "ما کان للنبی والذین آمنوا الخ" کی آیت شامل ہو گئی ہو۔ اس احتمال کا جواب علامہ حافظ جلال الدین سیوطی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب الاتقان فی علوم القرآن، میں دیا ہے جس کا اردو ترجمہ بھی حال ہی میں نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ علامہ موصوف لکھتے ہیں۔

"ابن الغرس نے لکھا ہے یہ سورہ مدنی ہے مگر دو آیتیں "لقد جاءکم رسول الی آخرھا" اس سے مستثنیٰ ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ

قول بھی عجیب وغریب ہے۔ جب ایک طرف اس سورۃ کا سب سے آخر میں نازل ہونا ثابت ہو چکا ہے تو یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کی دو آیتیں مکی ہوں"۔ (الاتقان، جلد ا، ص ۳۲)۔

(۲) پھر اسی موضوعات کبیر میں ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ "حدیث کے موضوع ہونے کی علامات میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ حدیث قرآن کے صریح خلاف ہو"۔ (موضوعات کبیر، ص ۵۲۵) حدیث زیر بحث کے متن سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلعم جناب ابوطالب کو دعوت دین دینے ایسے وقت تشریف لے گئے جب اُن پر سکرات کا عالم طاری تھا اور اس یقین کے ساتھ دعوت دینے لگے کہ قبول دعوت کی صورت میں وہ اُن کو نفع پہنچائے گی۔ اگر اس حدیث کو صحیح تسلیم کیا جاتا ہے تو حضور صلعم کا یہ فعل اور یقین قرآن اور سنت الٰہیہ کے خلاف قرار پاتا ہے جس میں کبھی تبدیلی کا امکان نہیں۔ سورۂ یونس میں فرعون کے ذکر میں ہمیں یہ آیت ملتی ہے:-

حتّٰی اذا ادرکہ الغرق قال اٰمنت انہ لا الٰہ الا الذی اٰمنت بہ بنوا اسرائیل وانا من المسلمین ٥ اٰلٰئن وقد عصیت قبل وکنت من المفسدین ٥ (سورۂ یونس، آیات ۹۰، ۹۱)	جب فرعون ڈوبنے لگا تو کہنے لگا کہ جس خدا پر بنو اسرائیل ایمان رکھتے ہیں، میں بھی اُس پر ایمان لاتا ہوں۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں فرمانبردار بندوں سے ہوں۔ (آواز آئی کہ) اب ایمان لاتا ہے

حالانکہ اس سے پہلے زندگی بھر
نافرمانی کرتا رہا اور فساد کرنے
والوں میں شامل رہا۔

ان آیات قرآنی سے صاف ظاہر ہے کہ اگر موت کا سامنا ہو تو اُس وقت ایمان لانا نفع بخش نہیں۔ چنانچہ ان ہی آیات کی تفسیر میں علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

"قبض رُوح اور معائنۂ عذاب کے وقت ایمان لانا "ایمان غرغرہ" یا "ایمان بأس" یا "ایمان یاس" کہلاتا ہے جو اہل سُنّت والجماعت کے نزدیک نافع نہیں۔ شیخ عبدالوہاب شعرانی نے کتاب "الیواقیت الجواہر" میں فتوحات مکیہ" سے عبارت نقل کی ہے جس میں ایمان فرعون کی بابتہ یہی تصریح ہے"۔ (تفسیر علامہ شبیر احمد عثمانی برحاشیہ قرآن مترجم مولانا محمود الحسن)

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے چنانچہ حدیث صحیح میں ارشاد ہے۔

"ان اللّٰہ تعالیٰ یقبل توبۃ العبد مالم یغرغر" یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی توبہ اُس وقت تک قبول فرماتا ہے کہ جب تک اُس کا گھونگرو بولنا شروع نہ ہوا اور اُس پر سکرات موت طاری نہ ہوئی ہوں۔ (تفسیر کبیر جلد ۴، ص ۹۰)

یہ حدیث عین مطابق قرآن ہے کیونکہ سورۂ مومن میں ارشاد رب العزت ہے:-

فلمّا رأوا باسنا قالوا اٰمنّا باللّٰہ وحدہ وکفرنا بما کنّا بہ مشرکین ○ فلم یک ینفعھم ایمانھم لمّا رأوا باسنا سنّۃ اللّٰہ الّتی قد خلت فی عبادہ وخسر ھنالک الکفرون ○
(سورۂ مومن، آیات)

(امم ماسبق کے لوگوں نے) جب ہمارے عذاب کو دیکھ لیا تو کہنے لگے کہ ہم یکتا خدا پر ایمان لائے اور جن کو ہم اُس کا شریک گردانتے تھے۔ اب ہم اُن کو نہیں مانتے۔ تو جب انہوں نے ہمارا عذاب آتے دیکھ لیا تو اب اُن کا ایمان لانا فائدہ مند نہیں ہو سکتا یہ خدا کی سُنّت ہے جو اپنے بندوں کے بارے میں سدا سے چلی آتی ہے اور کافر لوگ اُس وقت خسارہ میں رہے۔

تصریحات بالا کی موجودگی میں حضور صلعم سے یہ فعلِ عبث منسوب کیا ہی نہیں جا سکتا کہ وہ ایسے وقت میں کہ جب جناب ابو طالب کی قبض روح کا وقت ہو اُس وقت جا کر انہیں دعوت دین دیں اور یہ بھی فرمائیں کہ اگر اس وقت وہ ایمان لے آئیں تو وہ انھیں فائدہ دے گا اور آپ اُن کی بارگاہ ایزدی میں سفارش کریں گے۔ پس یقیناً یہ حدیث احتضارِ ابی طالب موضوع حدیث ہے اور اس سے نہ حضرت ابو طالب کا حالت شرک میں انتقال کرنا ثابت ہوتا ہے۔

اور نہ اُن کے والد جناب عبدالمطلب کا۔

حدیث دوئم۔ حدیث احیاء عبدالمطلب

دوسری روایت جو حضرت عبدالمطلب کے حالت شرک میں مرنے پر دلالت کرتی ہے اُس کا لُبِّ لباب صاحب سیرۃ الحلبیہؒ کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"ان اللّٰہ تعالٰی احیاء لہ بعد البعثۃ حتّٰی اٰمن بہ ومات"

یعنی اللہ تعالٰی نے حضور صلعم کے مبعوث ہونے کے بعد عبدالمطلب کو زندہ کیا یہاں تک کہ وہ اُن پر ایمان لائے اور پھر مر گئے۔

(سیرۃ الحلبیۃ جلد۱، ص ۴۲)

اس قول کو نقل کرنے کے بعد صاحب سیرہ الحلبیہؒ لکھتے ہیں:۔

"وھذا اضعف الاقوال واوھاھا" یعنی یہ قول سب سے زیادہ ضعیف اور سب سے زیادہ واہی ہے۔

پس اس روایت سے بھی حضرت عبدالمطلب کا شرک ثابت نہیں ہوتا۔

حدیث سوئم: مَنْ مَاتَ عَلٰی مثل ما مات علیہ عبد المطلب دخل النار

یہ تیسری اور آخری حدیث ہے جس کو جناب عبدالمطلب کے

مشرک ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ حدیث حضور صلعم نے کس موقع پر ارشاد فرمائی اس کے متعلق ہم سیرۃ الحلبیہ کی عبارت کا اُردو ترجمہ ہدیۂ قارئین کرتے ہیں۔ صاحب سیرۃ الحلبیہ لکھتے ہیں:-

"جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (بعد وفاتِ ابوطالب) قریش کے فاسد ارادوں کو دیکھا تو فرمایا: اے چچا ابوطالب! افسوس آپ نہیں کس قدر جلد داغ مفارقت دے گئے۔ جب ابولہب کو اس کی خبر پہونچی تو وہ آپ کی نصرت کے لئے کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا: اے محمدؐ! جو تم چاہتے ہو کرو اور جو کچھ تم ابوطالب کی زندگی میں کیا کرتے تھے وہ اب بھی شوق سے کرتے رہو۔ قسم ہے لات و عزّیٰ کی جب تک میرا دم میں دم باقی ہے تمہارا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔ اسی زمانہ میں ایسا اتفاق ہوا کہ ابن الغیطلہ نے ایک روز حضور صلعم کو برا بھلا کہا۔ یہ سنکر ابولہب اُس کی طرف بڑھا اور اُس نے ابن العیطلہ پر سخت لے دے کی۔ یہ دیکھ کر ابن العیطلہ پلٹا اور چلا کر کہنے لگا: اے گروہ قریش! ابوعتبہ یعنی ابولہب اپنے مذہب سے منحرف ہوگیا۔ قریش ابولہب کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے کہ کیا تم نے عبدالمطلب کے دین کو چھوڑ دیا۔ اُس نے جواب دیا کہ میں نے عبدالمطلب کے دین کو نہیں چھوڑا ہے لیکن میں نے اپنے بھتیجے کو ظلم و جور کے شکار ہونے سے بچانے کا تہیّہ کیا ہے تاکہ وہ جو چاہے آزادی سے کرے۔ انہوں نے کہا کہ تم نے جو کچھ کیا خوب کیا اور اس طرح تم صلۂ رحم بجا لائے۔ اس

طرح کچھ دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح گزارے کہ قریش میں سے کوئی بھی آپ سے مزاحم نہیں ہوتا تھا اور سب ابولہب سے ڈرتے تھے۔ ایک روز ابوجہل اور عقبہ بن ابی مُعیط ابولہب کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ کیا تمہارے بھتیجے محمدؐ نے تمہیں یہ بتلایا ہے کہ تمہارے باپ عبدالمطلب کہاں ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ وہ دوزخ میں ہیں۔ یہ سُنکر ابولہب نے کہا: اے محمدؐ! کیا عبدالمطلب دوزخ میں جائیں گے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، اور جو شخص بھی اُس مسلک پر مرے گا جس پر عبدالمطلب تھے داخل جہنم ہوگا۔" اس پر ابولہب نے کہا: چونکہ تمہارا یہ خیال ہے کہ عبدالمطلب جہنمی ہیں اس لئے میں بھی تمہارا جانی دشمن ہو کر رہوں گا۔ پس ابولہب اور دیگر تمام قریش نے آنحضرت صلعم کی دشمنی پر سختی سے کمر باندھ لی"۔ (سیرۃ الحلبیہ جلد ۱، ص ۳۳۶)

روایت مذکور الصدر سے ظاہر ہے کہ حضور صلعم کے اس قول کا راوی کہ "جو شخص بھی اُس مسلک پر مرے گا جس پر عبدالمطلب تھے داخل جہنم ہوگا" ابولہب ہے۔ اب ہم ابولہب کی بیان کردہ حدیث پر اُسی اُصول سے تبصرہ کرتے ہیں کہ جس سے علامہ ابن حجر عسقلانی نے "اصابہ" میں حضرت عباسؓ کی اُس روایت پر تبصرہ کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جب جناب ابوطالب کی وفات کا وقت قریب ہوا تو حضرت عباسؓ نے کان لگا کر سُنا اور پیغمبر اسلام سے کہا: اے میرے بھتیجے! واللہ میرے بھائی وہی کلمہ (توحید) کہہ رہے ہیں جس

کے کہنے کا آپ نے اُنہیں حکم دیا تھا۔ (سیرۃ ابن ہشام اردو، جلد ا ص ۴۳۰)۔ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ابن حجر اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:-

"اِنَّ العباس ما ادّیٰ ھٰذہ الشہادۃ وھو مسلم، وانما ذکرھا قبل ان یُسلِمَ فلا یُعتَدُّ بھا"۔ (اصابہ، جلد ۴، ص ۱۱۷)

(ترجمہ): بہ تحقیق عباسؓ نے یہ شہادت اُس وقت نہیں دی کہ جب وہ مسلمان ہوگئے تھے۔ انھوں نے یہ شہادت اسلام قبول کرنے سے پہلے دی۔ اس لئے اس پر کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

پس جس طرح ایمان ابوطالب کے متعلق حضرت عباسؓ کی شہادت اس لئے قابل قبول نہیں کہ وہ اُس وقت تک مشرک تھے اسی طرح حضرت عبدالمطلب کے متعلق ابولہب کی یہ شہادت کہ اُن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص بھی اُس مسلک پر مرے گا جس پر عبدالمطلب تھے وہ داخل جہنم ہوگا، قابل قبول و اعتبار نہیں کیونکہ ابولہب کا تو خاتمہ ہی کفر و شرک پر ہوا۔ البتہ عصبیت دوسری چیز ہے کہ کوئی شخص ایک کافر کی شہادت اس لئے رد کر دے کہ جس واقعہ کی وہ شہادت دے رہا ہے وہ اُس کے نظریہ کے خلاف ہے اور دوسرے کافر کی شہادت اس لئے قبول کرلے کہ جس بات کے متعلق وہ شہادت دے رہا ہے وہ اُس کے نظریہ کے موافق ہے۔ اس عصبیت کا کوئی علاج نہیں۔

یہ ہے وہ تمام ذخیرۂ روایات جس کو جناب عبدالمطلب کے مشرک ہونے کے ثبوت میں بڑے طمطراق سے پیش کیا جاتا ہے۔ قارئین گرام نے دیکھ لیا ہوگا کہ یہ پورا ذخیرہ ایک دفترِ بے معنی سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔

باب دوئم

جناب عبداللہ پدر عالی قدر حضرت رسول اللہؐ کے مذہب کے بیان میں

آنحضرت ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پدر عالی قدر جناب عبداللہ کے موحد ہونے پر ہزاروں دلیلوں کی ایک دلیل وہ قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے جو آپ نے منزل فخر و مباہات میں ارشاد فرمایا کہ "انا ابن الذبیحین" یعنی میں دو ذبیحوں کا فرزند ہوں۔ چنانچہ علامہ شہرستانی لکھتے ہیں: وَبِهٖ افتخر النّبیّ علیہ الصلوٰۃ والسلام حین قال: "انا ابن الذبیحین" یعنی نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جناب عبداللہ پر یہ ارشاد فرما کر فخر کیا کہ میں دو ذبیحوں کا فرزند ہوں (الملل والنحل للشہرستانی، الجزء الثانی ص ۲۴۹ طبع مصر ۱۳۱۷ھ) اکثریت علمائے اسلام کا کہنا ہے کہ اس قول رسولؐ میں ذبیح اول سے جناب اسمٰعیل علیہ السلام اور ذبیح دوئم سے حضرت عبداللہ مراد

ہیں۔ (سیرۃ الحلبیۃ، جلد ۱، ص ۳۵)۔

ذبیح اوّل جناب اسمٰعیلؑ کا قصہ سورہ الصّٰفّت میں اس طرح مذکور ہے کہ جناب ابراہیمؑ کو حضرت اسمٰعیلؑ کی ولادت کی بشارت ان الفاظ میں دی گئی: فبشرناہ بغلامٍ حلیمٍ۔ جب کچھ عرصہ بعد حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے فرزند کو ذبح کر رہے ہیں۔ جب حضرت اسمٰعیلؑ اپنے باپ کے ساتھ سعی کرنے کے قابل ہو گئے تو ایک روز حضرت ابراہیم نے اُن سے کہا کہ "بیٹا! میں خواب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ غور کر کے جواب دو کہ تمہارا اس کے متعلق کیا خیال ہے۔ جناب اسمٰعیلؑ نے بلا تامل عرض کیا کہ جو کچھ آپ کو بارگاہ احدیت سے حکم دیا گیا ہے اُس کی تعمیل کیجئے۔ انشاء اللہ آپ مجھ کو صابرین میں سے پائیں گے۔ چنانچہ جب دونوں باپ بیٹے حکم خدا کی تعمیل کرنے پر تیار ہو گئے حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے کے ارادہ سے زمین پر پچھاڑ دیا اور اُن کے گلے پر چھری رکھ دی تو غیب سے آواز آئی کہ اے ابراہیم! بس کرو، تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نے اس قربانی کو ایک بڑی قربانی سے بدل دیا اور ہم نیکو کاروں کو یوں ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

ذبیح دوم جناب عبداللہ کی قربانی کا مختصر اً قصہ ہے کہ جناب عبدالمطلب نے یہ نذر کی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ کو دس فرزند عطا کریگا تو میں اُن میں سے ایک کو خدا کی راہ میں قربان کر دوں گا۔ جب اللہ

نے اُن کو دس فرزند عطا کر دیئے تو ایک روز اُنہوں نے اپنے لڑکوں سے کہا کہ مجھے تم میں سے ایک کی قربانی کرنی ہے۔ تم قرعہ اندازی کرو تا کہ معلوم ہو سکے کہ کس کو قربان کرنا ہے۔ چنانچہ لڑکوں نے قرعے ڈالے اور حضرت عبداللہ کے نام قرعہ نکلا۔ عبدالمطلب جناب عبداللہ کو قربان گاہ میں لے گئے اور اُنہیں قربانی کے لئے زمین پر پچھاڑ کر چھری اُن کے گلے پر رکھدی، اہل مکہ کے بے حد اصرار پر عبدالمطلب اُس وقت اپنے ارادہ سے باز رہے اور اس تجویز پر تیار ہو گئے کہ اس سلسلہ میں مدینہ کی مشہور کاہنہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ چنانچہ عمائدین مکہ کے ساتھ عبدالمطلب کاہنہ کے پاس گئے۔ اُس نے کہا کہ تم لوگوں کو چاہیئے کہ پہلی مرتبہ دس اونٹوں اور عبداللہ پر قرعہ اندازی کی جائے۔ اگر قرعہ عبداللہ پر ہی نکلے تو دس۔ دس اونٹ اضافہ کر کے قرعہ اندازی کی جائے یہاں تک کہ قرعہ اونٹوں پر نکل آئے۔ یہ لوگ واپس مکہ آئے۔ کاہنہ کی تجویز کے مطابق قرعہ اندازی کی گئی تو سو اونٹوں پر قرعہ نکلا۔ جناب عبدالمطلب نے مزید اطمینان کے لئے تین مرتبہ قرعہ اندازی کرائی لیکن ہر مرتبہ جب اونٹوں کی تعداد ۱۰۰ پر پہونچی تو بجائے حضرت عبداللہ کے قرعہ ۱۰۰ اونٹوں پر نکلا۔ حضرت عبدالمطلب نے سو اونٹوں کی قربانی کی اور اُس روز سے مقتول کی دیت ۱۰۰ اونٹ قرار پائی۔ اسلام نے بھی اس دیت کو قائم رکھا۔

اگر حضرت عبد اللہ توحید پرست اور ملّت ابراہیمی کے پیرو نہ ہوتے تو پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام اُن کی ابنیت پر مفتخر نہ ہوتے کیونکہ فتح مکہ کے موقع پر آپ نے علی الاعلان اپنے خطبہ میں یہ ارشاد فرما دیا تھا کہ زمانۂ جاہلیت کے کافر و مشرک آباء و اجداد پر فخر و مباہات ممنوع ہے۔ (سیرۃ الحلبیہ، جلد ۲، ص ۲۲۲)۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا اپنے پدر عالی قدر کو بہ اعتبار مفاخرت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی صف میں جگہ دینا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ حضرت عبد اللہ توحید پرست اور ملّت ابراہیمی کے پیرو تھے۔

ممکن ہے کہ اس منزل پر کسی کو یہ خیال ہو کہ حضور صلعم نے یہ ارشاد کہ میں دو ذبیحوں کا فرزند ہوں فتح مکہ سے قبل فرمایا ہو اور پھر اُس خطبہ کے پیش نظر جو آپ نے فتح مکہ کے دن ارشاد فرمایا آپ آئندہ اس فخر و مباہات سے محترز رہے ہوں؟ کیا اس کا کوئی ثبوت ہے کہ فتح مکہ کے بعد بھی آپ نے اس قول کا اعادہ کیا؟

اس اعتراض کے جواب کو کما حقہٗ سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ دو باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ اوّل یہ کہ حدیث رسول کا اطلاق نہ صرف قول و فعل رسولؐ پر ہوتا ہے بلکہ تقریر پر بھی ہوتا ہے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی مقدمہ مشکوٰۃ المصابیح میں تحریر فرماتے ہیں۔

"تقریر کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

کی موجودگی میں کچھ کہا ہو اور آپ نے نہ تو اُس کا انکار کیا اور نہ منع کیا بلکہ خاموش رہے اور قائم رکھا" (اردو ترجمہ مقدمۂ مشکوٰۃ المصابیح از شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱، مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص کے قول کو سُنکر حضور صلعم نے خموشی اختیار کی ہو اور نہ اُس قول سے انکار کیا ہو اور نہ اُس کے کہنے سے منع کیا ہو تو وہ بھی حدیث ہی کی تعریف میں آتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ تاریخ سے یہ بخوبی ثابت ہے کہ معاویہ ابن ابی سفیان ۸ھ میں فتح مکّہ کے دن مسلمان ہوئے۔ چنانچہ علامہ سیوطی لکھتے ہیں: "اسلم ھو و ابوہ یوم فتح مکۃ" یعنی معاویہ اور اُن کے والد دونوں فتح مکّہ کے دن مسلمان ہوئے۔ (تاریخ الخلفا للسیوطی، ص ۱۴۸)۔ ظاہر ہے کہ فتح کے موقع تک امیر معاویہ حزب مخالف میں شامل تھے جو پیغمبر اسلام سے برسرپیکار تھا۔ اُنھیں خدمت رسول مقبول میں حاضر ہونے کا شرف فتح مکّہ کے بعد سے نصیب ہوا کہ جب وہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

معترض کے اعتراض کا جواب امیر معاویہ کی بیان کردہ ایک حدیث سے ملتا ہے جس کا اُردو ترجمہ ہم سیرۃ الحلبیہ" سے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:۔

معاویہ کہتے ہیں: "ہم خدمت رسول صلعم میں حاضر تھے کہ اچانک ایک اعرابی آیا اور اپنے ملک میں خشک سالی کی شکایت کرنے لگا۔

اُس نے عرض کیا کہ میں نے اپنے ملک کو اس حالت میں چھوڑا ہے کہ مویشی ہلاک ہو رہے تھے اور اہل و عیال ضائع ہو رہے تھے۔ یا ابن الذبیحین (اے دو ذبیحوں کے فرزند) اللہ نے جو مال غنیمت آپ کو عطا کیا ہے اُس میں سے کچھ ہمیں بھی عطا کر کے ممنون کیجئے۔ یہ سُنکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور اعرابی نے جس لقب سے خطاب کیا تھا اُس سے انکار نہیں کیا۔"

(سیرۃ الحلبیۃ، جلد ۱، ص ۳۵)

اس روایت سے ظاہر ہے کہ پیغمبر اسلام نے فتح مکہ کے بعد بھی تقریباً یہ حدیث ارشاد فرمائی کہ میں دو ذبیحوں یعنی حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت عبد اللہ کا فرزند ہوں۔ اگر معاذ اللہ حضرت عبد اللہ مسلک کفر و شرک پر چلتے ہوتے تو آپ فتح مکہ کے بعد ہرگز اُن کو حضرت اسمٰعیلؑ کی صف میں جگہ نہ دیتے اور نہ اُن پر فخر و مباہات کرتے۔

ایک اعتراض

کیا جیسا کہ علمائے یہود و نصاریٰ اور بعض علمائے اسلام
کا خیال ہے یہ حقیقت ہے کہ ذبیح اوّل حضرت اسحٰقؑ ہیں

بے شک علمائے یہود و نصاریٰ کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت اسحٰقؑ ذبیح اللہ ہیں اور ایک گروہ علمائے اسلام بھی اسی طرف گیا ہے لیکن خواہ وہ علمائے یہود و نصاریٰ ہوں یا علمائے اسلام، اس نظریہ کا حقیقت

سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ قبل اس کے کہ ہم اس نظریہ کے بطلان پر دلائل پیش کریں، ہم اس امر واقعہ کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اوّل حضرت سارہ سے شادی کی اور پھر کچھ عرصہ بعد حضرت ہاجرہ سے عقد کیا۔ حضرت سارہ کے بطن سے حضرت اسحٰقؑ پیدا ہوئے جو تمام انبیائے بنی اسرائیل کے جدِ اعلیٰ ہیں اور حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسمٰعیل پیدا ہوئے جن کو مع اُن کی والدہ جناب ہاجرہ کے جناب ابراہیم علیہ السلام نے بے آب و گیاہ وادی میں مکہ کے قریب آباد کیا۔

علمائے یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں دلائل

توارات میں ہے کہ حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسمٰعیل پیدا ہوئے اور اُس وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر چھیاسی برس کی تھی۔ (کتاب پیدائش، باب ۱۶، آیات ۱۵-۱۶)

جب حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۹۹ سال اور حضرت اسمٰعیل کی عمر ۱۳ سال تھی تو انھیں اپنی اور اپنے خاندان کے لوگوں کی خواہ جوان ہوں یا بچّے، ختنہ کرانے کا حکم ہوا اور اُنھیں آیندہ سال بطن سارہ سے ولادتِ اسحٰق کی بشارت بھی دی گئی (پیدائش باب ۱۷)۔ جب حضرت ابراہیمؑ کی عمر سَو سال کی ہوئی تو اُن کے گھر میں اسحٰقؑ پیدا ہوئے (پیدائش، باب ۲۱، آیت ۴) ان آیات توارات سے بخوبی ثابت ہے

حضرت اسحٰق کی پیدائش کے وقت حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر ۱۴ سال تھی۔ اب توراۃ کی وہ آیت غور طلب ہے جس کی بناء پر حضرت اسحٰق علیہ السلام کو ذبیح اللہ کہا جاتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:۔

"اور اس (خداوند) نے کہا: تو اپنے بیٹے، ہاں اپنے اکلوتے بیٹے اسحٰق کو لے جسے تو پیار کرتا ہے اور سرزمین موریاہ میں داخل ہوجا اور وہاں کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جس کا نام میں تجھے بتلا دونگا اُس کو سوختنی قربانی کے طور پر قربان کر دے"۔ (پیدائش باب ۲۲ آیۃ ۲)۔

اس آیۂ توراۃ میں تحریف نمایاں نظر آتی ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم جس بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے لے گئے تھے وہ اکلوتا تھا اور آیات مذکور الصدر میں یہ ذکر آچکا ہے کہ حضرت اسحٰقؑ اسمٰعیلؑ کے چودہ برس بعد پیدا ہوئے۔ اس لئے یہ ظاہر ہے کہ یہ واقعہ اُس زمانہ کا ہے جب حضرت ابراہیمؑ کے ہاں صرف ایک ہی بیٹا تھا۔ یعنی یہ واقعہ حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش سے پہلے کا ہے اور اس وقت صرف حضرت اسمٰعیل موجود تھے۔ اس سے بخوبی ثابت ہے کہ کتاب پیدائش کے بائیسویں باب کی دوسری آیت میں اکلوتے بیٹے کے بعد حضرت اسحٰق کا نام بعد کا اضافہ ہے اور یہ قرآن کریم کے اس دعوے کی ایک بین مثال ہے کہ "من الذین ھادوا یحرفون الکلم عن مواضعہ" (سورہ نساء آیت ۴۶) یعنی یہودیوں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کلمات الٰہی کو اُن کے محل و موقع سے تغیر و تبدل

کر دیتے ہیں۔

تاریخ سے بھی حضرت اسحٰق کو ذبیح اللہ قرار دینے میں تحریف کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ محمد بن اسحٰق نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کی ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ میں ایک روز عمر ابن عبد العزیز کے پاس تھا کہ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ ذبیح کون ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اسمٰعیلؑ اور اس پر خدا کے اس قول کو دلیل میں پیش کیا: "وبشرناه باسحٰق نبیاً من الصّٰلحین"، یہ سنکر عمر ابن عبد العزیز نے شام سے ایک یہودی کو بلا بھیجا جو مسلمان ہو گیا تھا اور جس کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ وہ علمائے یہود میں سے ہے۔ جب وہ حاضر ہوا تو عمر بن عبد العزیز نے اُس سے یہ سوال دریافت کیا اور میں اُس وقت وہاں موجود تھا۔ یہودی نے جواب دیا کہ ذبیح اللہ حضرت اسمٰعیل ہیں پھر کہا: خدا کی قسم! اے امیر المومنین، علمائے یہود اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں لیکن وہ عربوں سے اس لئے حسد کرتے ہیں کہ اُن کے جد اعلیٰ کو کہیں وہ حقیقی شرف و منزلت نہ مل جائے جو حقیقت میں اُن کا حق ہے۔ اس لئے وہ حضرت اسمٰعیل کے ذبیح اللہ ہونے سے انکار کرتے ہیں اور اس غلط خیال کو لئے ہوئے ہیں کہ ذبیح اللہ اسحٰقؑ ہیں کیونکہ وہ اُن کے جد اعلیٰ ہیں"۔ (تفسیر مجمع البیان لطبرسی جلد ۸ ص ۴۵۳، تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص ۱۸)

اُن علمائے اسلام کے مقابلہ میں دلائل جو حضرت اسحٰقؑ کو ذبیح اللہ مانتے ہیں

قرآن مجید میں سورۂ الصافات کے تیسرے رکوع میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے فرزند کی جو قربانی پیش کی اُس کا قصہ مذکور ہے قرآن اُس فرزند ابراہیم علیہما السلام کے نام کی تصریح نہیں کرتا۔ اُس کے متعلق صرف یہ تبلاتا ہے کہ یہ واقعہ اُس وقت پیش آیا کہ جب وہ سعی بجالانے کی عمر کو پہونچ گیا۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ اس وقت اُس لڑکے کی عمر ۱۳ سال کی تھی (تفسیر مجمع البیان جلد ۸، ص ۴۵۲)۔ پھر اس واقعہ کے متعلق قرآن کا بیان ہے " اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ (سورہ الصافات، آیت ۱۰۷)۔ یعنی بلاشبہ یہ ایک بڑا صاف امتحان اور کھلی ہوئی آزمائش تھی۔ پسر کی قربانی کو آزمائش و امتحان اُسی وقت کہا جاسکتا ہے کہ جب قربان ہونے والے فرزند کے متعلق نہ یہ خبر دی جائے کہ وہ جوانی کی رعنائیوں سے ہم آغوش ہوگا اور نہ یہ تبلایا جائے کہ اُس کے اولاد ہوگی اور اس کی نسل چلے گی۔ اگر اس تیرہ سالہ فرزند کے متعلق کہ جس کی قربانی کا حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا گیا تھا قربانی سے پہلے کسی وقت بھی اُس کے والدین کو یہ خبر اور بشارت دیدی جاتی کہ وہ جوانی کی عمر کو پہونچے گا اور صاحب اولاد بھی ہوگا

تو پھر اس کو آزمائش کہنا سراسر لغو ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ پورے قرآن میں اس فرزند ابراہیمؑ کے متعلق کہیں یہ ذکر نہیں آیا کہ وہ جوانی کی عمر کو پہونچے گا یا اُس کے اولاد ہوگی۔ البتہ سورۂ ہود کے ساتویں رکوع میں حضرت اسحٰق علیہ السلام کے متعلق یہ تذکرہ ملتا ہے کہ جب فرشتے قوم لوط کی تباہی کے لئے نازل ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کے پاس ایک بشارت لیکر آئے۔ زوجۂ جناب ابراہیمؑ جو اُس وقت وہیں کھڑی ہوئی تھیں یہ سُنکر ہنسیں۔ فرشتوں نے اُس کو ولادت اسحٰق کی اور اسحٰقؑ کے بیٹے یعقوب علیہ السّلام کی بشارت دی۔ قرآنی الفاظ ہیں۔ "فَبَشَّرْنَاهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ہ یعنی ہم نے (فرشتوں کے ذریعہ) زوجۂ حضرت ابراہیمؑ کو ولادت اسحٰقؑ کی اور اس کے بعد اسحٰقؑ کے بیٹے یعقوب کی بشارت دی۔ ظاہر ہے کہ جس فرزند کی ولادت کے وقت ہی اُس کے والدین کو یہ خوشخبری دیدی گئی ہو کہ وہ نہ صرف شباب کی رعنائیوں سے ہمکنار ہوگا بلکہ وہ صاحب اولاد بھی ہوگا اُس کی قربانی کا حکم دینا اور پھر اُس کو کھلی ہوئی آزمائش قرار دینا عند العقلا بے معنی چیز ہے۔ اس آیت سے بخوبی ثابت ہے کہ جس فرزند کی قربانی کا ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں حکم ہوا تھا وہ حضرت اسحٰقؑ نہیں بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ تھے۔

اس آیۂ کریمہ "فَبَشَّرْنَاهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ" کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

"اس آیت کی روشنی میں یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ ذبیح اللہ اسحٰقؑ ہوں کیونکہ اُن کے متعلق تو (ولادت سے قبل ہی) یہ بشارت مل چکی تھی کہ وہ جوان ہوں گے اور اُن کے ایک فرزند حضرت یعقوبؑ پیدا ہوگا۔ پس حالت صغرسنی اور لڑکپن میں اسحٰق کے ذبح کرنے کا کیونکر حکم دیا جا سکتا ہے جبکہ اُس وقت تک اُن کے یہاں وہ فرزند یعقوبؑ پیدا نہیں ہوا جس کے پیدا ہونے کا خدا وعدہ فرما چکا ہے اور اللہ کا وعدہ حق ہوتا ہے جس کے خلاف نہیں ہو سکتا پس یہ ناممکن ہے کہ ان حالات میں حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحٰقؑ کے ذبح کرنے کا حکم دیا جائے۔ یہاں سے اچھی طرح ثابت ہوگیا کہ ذبیح اللہ حضرت اسمٰعیلؑ تھے اور حضرت اسمٰعیلؑ کے ذبیح اللہ ہونے پر یہ قوی ترین، صحیح ترین اور واضح ترین استدلال ہے۔"

(تفسیر ابن کثیر عربی، جلد ۲ ص ۴۵۲)

اب صرف یہ چیز غور طلب رہ جاتی ہے کہ قرآن مجید میں حضرت اسمٰعیلؑ کے ذبیح اللہ ہونے پر اس قدر واضح بیان ہوتے ہوئے کتب احادیث میں وہ روایات کیسے داخل ہوئیں جن میں حضرت اسحٰق علیہ السلام کو ذبیح اللہ کہا گیا ہے۔ یہ تمام احادیث و اقوال علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں نقل کئے ہیں اور اس کے بعد لکھا ہے: وھٰذہ الاقوال کلھا مَاخوذۃٌ عن کعب الاحبار" یعنی یہ تمام اقوال کعب الاحبار یہودی سے لئے گئے ہیں۔ پھر علامہ موصوف لکھتے ہیں:-

فانہ لمّا اسلم فی الدولۃ العمریّۃ جعل یحدّث عمر رضی اللہ عنہ عن کتبہ قدیماً ، فربما استمع لہ عمر رضی اللہ عنہ فترخص بعض الناس فی استماع ما عندہ ونقلوا ما عندہ عنہ غثہما وسمینہا۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۴، ص ۱۷)

(ترجمہ) جب کعب الاحبار نے حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں اسلام قبول کیا تو وہ اُن سے یہودیوں کی کتب قدیم کے تذکرے بیان کرنے لگا۔ ایسے بھی مواقع ہوتے تھے جب حضرت عمرؓ اُس کے بیان کردہ تذکروں کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ اس کو لوگوں نے کعب الاحبار کے بیان کردہ واقعات کی طرف توجہ دینے کی رخصت و اجازت کے مرادف سمجھا اور وہ اُس کے بیان کردہ واقعات کو اُن کے مضرت خیز نتائج اور سمیّت ریز عواقب سے بے پرواہ ہو کر اُس کے حوالہ سے نقل کرنے لگے۔ اس کے بعد علامہ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں :۔

"ولیس لہذہ الامّۃ حاجۃ الی حرف واحدٍ مّما عندہٗ"

یعنی اُمت مسلمہ کو کعب الاحبار کے بیان کردہ اقوال میں سے کسی ایک حرف کی بھی ضرورت نہیں۔ علامہ موصوف نے یہ بالکل صحیح کہا ہے کیونکہ اسرائیلیات سے اسلام کو شدید نقصان پہونچا ہے۔

اُن احادیث پر نقد و تبصرہ جو جناب عبد اللہ پدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشرک و جہنمی ہونے پر دلالت کرتی ہیں

حدیث اوّل "لیت شعری ما فعل ابوای" پر نقد و تبصرہ

ان میں سے پہلی حدیث وہ ہے جس کو علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس طرح نقل کیا ہے:۔

"عبد الرزاق نے کہا، ہم سے ثوری نے، اُس سے موسٰی بن عُبیدہ نے، اُس سے محمد بن کعب قرظی نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لیت شعری ما فعل ابوای، لیت شعری ما فعل ابوای، لیت شعری ما فعل ابوای" یعنی کاش مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میرے والدین نے کیا اعمال کیئے، کاش مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میرے والدین نے کیا اعمال کیئے، کاش مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میرے والدین نے کیا اعمال کیئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی "وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ" (سورۂ بقرہ آیت ۱۱۹) یعنی اے پیغمبر! تم سے اہل جہنم کے بارے میں کوئی باز پرس نہیں کی

جائے گی۔ (تفسیر ابن کثیر عربی، جلد ۱، ص ۱۶۲)

اب ہم اس حدیث لیث شعری مافعل البوای اتم" کو اصول روایت و درایت پر پرکھ کر دیکھتے ہیں :۔

اُصول روایت کی بناء پر اس حدیث پر تنقید

(۱) اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کرنے والے محمد بن کعب قرظی ہیں۔ ان کے بارے میں علامہ ابن عبدالبر بحوالہ قتادہ صرف اتنا لکھتے ہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں پیدا ہو گئے تھے (استیعاب جلد ۱، ص ۲۳۸)۔ ظاہر ہے کہ حالت صغر سنی میں انہوں نے یہ حدیث آنحضرت ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام سے نہیں سُنی ہو گی۔ انہوں نے کسی ایسے صحابی رسول سے اس حدیث کو سُنا ہو گا جس نے اس کو براہ راست آنحضرت صلعم سے سُنا لیکن اُس کا یہ نام نہیں بتلاتے۔ ایسی صورت میں یہ حدیث مُرسَل قرار پاتی ہے اور حدیث مُرسَل حجت نہیں ہوتی۔

(۲) پھر محمد بن کعب قرظی سے بیان کرنے والے موسیٰ بن عُبیدہ ہیں جن کے متعلق علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں :۔

" امام احمد کہتے ہیں : اس کی حدیث لکھے جانے کے قابل نہیں۔ امام نسائی وغیرہ کا کہنا ہے : یہ ضعیف الروایت ہے۔ ابن عدی کا قول ہے : اس کی روایات میں ضعف بیّن ہے۔ ابن معین کہتے ہیں :

اس کو بطور حجت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یحییٰ بن سعید کہتے ہیں: ہم اس کی حدیثوں سے بچا کرتے تھے۔ ابن سعد کا قول ہے: یہ ثقہ ہے لیکن حجت نہیں۔ یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں: یہ سچا انسان ہے لیکن حدیث میں بے حد ضعیف ہے۔ (میزان الاعتدال جلد ۴، ص ۲۱۳)۔

اس بیان سے ظاہر ہے کہ جس حدیث کا راوی حد درجہ ضعیف الروایۃ ہو اُس کی بیان کردہ حدیث نہ قابل حجت ہو سکتی ہے اور نہ اُس کی صحت کا کوئی اعتبار ہو سکتا ہے۔

اُصولِ درایت کے معیار پر اس حدیث پر تبصرہ

اُصولِ درایت کے مطابق بھی اس حدیث کا کوئی مقام نہیں۔ اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) آیۂ کریمہ "وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ" سورۂ بقرہ کی آیت ہے اور سورۂ بقرہ باتفاق مفسرین و محدثین مدنی سورہ ہے یعنی اس کا نزول بعد ہجرت شروع ہوا جس وقت آنحضرت صلوات اللہ علیہ کی عمر ۵۳ سال کی تھی۔ بے شک قول مشہور کے مطابق آپ کے والد ماجد کا انتقال آپ کی ولادت سے پہلے ہو گیا تھا اور آپ کی والدہ نے اُس وقت رحلت کی جب آپ کا سن شریف ۶-۷ سال کا تھا۔ لیکن کیا کوئی سلیم العقل انسان اس چیز کو باور کر سکتا ہے کہ مدنی زندگی تک آپ کو اپنے والد کے عقائد و اعمال کا علم نہ ہوا ہو۔

کیا آپ کے چچا حضرت حمزہؓ نے بعثت کے چوتھے سال اسلام قبول نہیں کر لیا تھا اور کیا ۳ ہجری میں غزوہ اُحد میں اُن کی شہادت نہیں ہوئی ؟ کیا حضرت عباسؓ عم جناب رسول مختار آپ کی وفات کے وقت زندہ نہیں تھے ؟ ان حضرات کی موجودگی میں جناب رسالت مآب کا اپنے بزرگوار عالی قدر کے عقائد و اعمال سے ناواقف رہنا عقلاً محال ہے۔ اور یہ فن درایت کا ایک مسلّمہ قاعدہ ہے کہ جو حدیث عقل کے خلاف ہو وہ قابل قبول نہیں ہوگی۔

(۲) اگر اس حدیث کو آیۂ "ولا تُسئَلُ عن اصحاب الجحیم" کی وجہ نزول تسلیم کیا جاتا ہے تو یہ سیاق و سباق کے خلاف ہوتا ہے۔ آیات ماسبق اور آیات مابعد مشرکین اہل کتاب کے بارے میں ہیں۔ اگر اس آیت کو حضرت عبداللہ کے متعلق مانا جاتا ہے تو یہ فصاحت و بلاغت قرآنی کے خلاف ہوگا، چنانچہ علامہ سیوطی مسالک الحنفاء میں لکھتے ہیں :-

"اس حدیث کے قابل ردّ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس آیت سے پہلی اور بعد کی آیات یہود کے بارے میں ہیں۔ ان آیات کی ابتدا آیہ "یا بنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم واوفوا بعھدی اوف بعھدکم و ایای فارھبون" (سورہ بقرہ آیت ۴۰) سے ہوتی ہے اور ان یہود کا قصہ آیہ "و اذ ابتلیٰ ابراھیم ربہ الخ" سے پہلی آیت پر ختم ہوتا ہے (سورہ بقرہ آیہ ۱۲۶)

جس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ آیۂ "ولا تُسئلُ عن اصحاب الجحیم" ان اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو کفر و شرک میں مبتلا تھے۔ (مسالک الحنفاء للعلامہ سیوطی، ص ۵۰)

(۳) آیۂ وافی ہدایہ "وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ" کی مروجہ قرأت کے مطابق تسئل کی تاء مضموم ہے اور اسی طرح لام بھی مضموم ہے یعنی لاتسئل مضارع منفی مجہول ہے۔ اس قرأت کے مطابق علامہ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ اسی قبیل کی آیات میں سے ہے جن میں رسول اللہ صلعم سے کہا گیا ہے کہ تمہارا فریضہ صرف تبلیغ کرنا ہے، تم لوگوں پر داروغہ نہیں بنائے گئے ہو۔ حدیث زیر بحث تو اس آیت کی شان نزول اس مفروضہ کے تحت بیان کیا جاتا ہے کہ لَاتَسْئَلُ نہی ہے یعنی جب اس آیت کے یہ معنی لیے جائیں کہ اے پیغمبر! تم دوزخیوں کے بارے میں ہم سے کوئی سوال نہ کرو۔ ایسے معنی لینا قرأت مروجہ کے خلاف ہوگا جس پر پوری اُمت کا اجماع ہے۔

ان ہی اسباب و وجوہ کی بناء پر اس حدیث کے متعلق علامہ سیوطی لکھتے ہیں:-

"واما حدیث لیت شعری ما فعل ابوای، معضل ضعیفا لاتقوم بہ حجۃ"۔ یعنی جہاں تک حدیث "لیت شعری ما فعل ابوای" کا تعلق ہے تو یہ حدیث معضل اور ضعیف ہے۔ اس سے

دلیل وحجت قائم نہیں ہو سکتی (الرسائل) التسع للسیوطی، رسالہ "التعظیم والمنۃ" ص ۹)

حدیث دوئم منع استغفار پر نقد و تبصرہ

(۲) دوسری حدیث جو حضرت عبد اللہ کے مشرک ہونے پر دلالت کرتی ہے تفسیر در منشور سیوطی میں اس طرح منقول ہے:۔

"ابن جریر نے عطیۂ عوفی کے طریق سے آیۂ ما کان للنبی والذین اٰمنوا الخ کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور صلعم نے اپنے والد کے لئے استغفار کرنے کا ارادہ کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اُنہیں ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا کہ ابراہیمؑ نے تو اپنے باپ کے مشرک ہوتے ہوئے بھی اُس کے لئے طلب مغفرت کی تھی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ" ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے طلب مغفرت کرنا اُس وعدہ کی وجہ سے تھا جو اُنہوں نے اُس سے کیا تھا لیکن جب (آذر کے بحالت کفر و شرک مرجانے سے) ابراہیم پر یہ واضح ہوگیا کہ وہ اہل جہنم سے ہے تو وہ اُس سے بے تعلق ہوگئے"

(تفسیر در منشور، جلد ۳، ص ۲۸۳)

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد علامہ سیوطی لکھتے ہیں:۔

"قُلت، ان ھذا الاثر ضعیف، معلول ۔ فان عطیۃ ضعیف

وهو مخالف لروایة علی ابن ابی طلحة عن ابن عباس السابقة وتلك اصح وعلی ثقة جلیل"

(ترجمہ) میں کہتا ہوں کہ یہ روایت ضعیف اور معلول ہے کیونکہ عطیہ عوفی ضعیف الروایۃ ہے۔ پھر یہ روایت اُس صحیح تر اور زیادہ قابل اعتماد روایت کے خلاف ہے جو علی ابن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے۔ (تفسیر درمنثور، جلد ۳، ص ۲۸۳)۔

علی ابن ابی طلحہ والی روایت جس کو علامہ سیوطی نے روایۃً ودرایۃً صحیح تر کہا ہے اس طرح وارد ہوئی ہے۔

"ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے علی ابن ابی طلحہ کے طریق سے حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ لوگ اپنے آبائے مشرکین کے لئے استغفار کیا کرتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی کہ نبی صلعم اور مومنین کے لئے یہ سزاوار نہیں کہ وہ مشرکین کے لئے دعائے مغفرت کریں خواہ وہ اُن کے قرابتدار ہی کیوں نہ ہوں خاص کر جب کہ اُن پر یہ واضح ہوگیا ہو کہ وہ جہنمی ہیں چنانچہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگ اُن لوگوں کے حق میں دعائے مغفرت کرنے سے روک دئے گئے جو مر چکے تھے لیکن زندوں کے حق میں دعائے مغفرت سے نہیں روکا گیا تا اینکہ اُن کا حالت شرک پر خاتمہ نہ ہو جائے۔ (تفسیر درمنثور، جلد ۳، ص ۲۸۲)

مذکورہ بالا بیان سے بخوبی واضح ہے کہ آیۂ وافی ھدایہ "ما

کان للنبی والذین آمنوا الخ کا حضرت عبد اللہ کے بارے میں نازل ہونا ثابت نہیں اور اس سے آپ کے بحالت کفر و شرک مرنے پر دلیل پیش نہیں کی جا سکتی۔

(۳) حدیث سوئم "اِنَّ ابی واباک فی النار" پر نقد و تبصرہ

تیسری حدیث وہ ہے جو امام مسلم نیشاپوری نے اپنی صحیح میں اس طرح درج کی ہے:۔

"ہم سے ابوبکر بن شیبہ نے، اُن سے عفان نے، اُن سے حمّاد بن سلمہ نے، اُن سے ثابت نے، اور اُن سے حضرت انسؓ نے بیان کیا کہ ایک شخص نے خدمت رسولؐ میں حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ! میرا باپ کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا: "دوزخ میں" جب اُس شخص نے جانے کے لئے رُخ پھیرا تو حضور صلعم نے اُسے پھر بلایا اور فرمایا: "مُن تیرا باپ اور میرا باپ دونوں دوزخ میں ہیں"۔ (صحیح مسلم عربی، جلد ۱، کتاب الایمان، باب من مات علی الکفر فھو فی النار، ص ۱۰۷)

جس باب میں اس حدیث کو جگہ دی گئی ہے اُس کے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عبداللہ پدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حالت کفر و شرک میں انتقال کیا اور اس وجہ سے اُن کا مقام جہنم ہے۔

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ یہ حدیث روایۃً و درایۃً کس حد تک صحیح ہے۔

اصول روایت کی بناء پر اس حدیث پر تنقید

اس حدیث کے راویوں میں ایک راوی حمّاد بن سلمہ ہیں۔ ان کے متعلق علامہ سیوطی بحوالۂ ذہبی لکھتے ہیں:۔

"حمّاد ثقہ تو ہیں لیکن اُن کے یہاں اوہام اور مناکیر (نامقبول باتیں) کثرت سے ملتی ہیں۔ اور اُن کا حافظہ بھی درست نہیں تھا۔ چنانچہ لوگوں کا اُن کے متعلق یہ قول تھا کہ ان کی کتابوں میں (خرابیٔ حافظہ کی وجہ سے) کتر بیونت کی گئی ہے۔ نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک شخص ابن ابی العرجاء ان کا پروردہ تھا جو ان کی کتابوں میں تحریف کیا کرتا تھا۔

ان کی ناقابل قبول روایتوں میں سے ایک وہ روایت ہے جو انھوں نے بواسطۂ ثابت حضرت انس رضؓ سے روایت کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: فلمّا تجلّی ربہ للجبل" یعنی جب اُس کے رب نے پہاڑ پر اپنی تجلّی ڈالی (سورۂ اعراف آیۃ ۱۴۳) اور پھر فرمایا: حق سبحانہٗ تعالیٰ نے اپنی چھنگلیا انگلی کا پوروا باہر نکالا اور اُس سے اپنے انگھوٹے پر زور دیا جس کے نتیجہ میں پہاڑ زمین میں دھنس گیا۔" یہ وہ حدیث ہے جس کو امام احمدؒ، ترمذی اور حاکم نے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ امام مسلم کی شرط کے مطابق یہ حدیث صحیح ہے لیکن ابن جوزی نے اس کو موضوع حدیث شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتی۔ یہ انھیں حدیثوں میں سے ہے جن کو

حماد بن سلمہ کے پروردہ نے تحریف کی تھی اور حماد کی روایات میں کثرت سے مناکیر (ناقابل قبول باتیں) پائے جاتے ہیں۔

سیوطی کہتے ہیں: میں نے اس منکر حدیث کو اس وجہ سے بیان کیا ہے کہ اس کی سند یعنی سلسلہ رواۃ وہی ہے جو حدیث زیر بحث کا ہے کہ حضور صلعم نے اعرابی سے فرمایا کہ میرا باپ اور تیرا باپ دونوں دوزخ میں ہیں۔ اسی حماد کی سب سے بڑھی ہوئی منکر حدیث وہ ہے جو اس نے قتادہ اور عکرمہ کے واسطے سے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا: "میں نے اپنے رب کو اس حال میں دیکھا کہ اس کے گھنگریالے بال تھے اور ریش صاف تھی اور وہ سبز لباس پہنے ہوئے تھا"۔ یہ حدیث بھی اُن احادیث میں سے ہے کہ جس کو ابن جوزی نے موضوعات میں جگہ دی ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ حدیث متنازعہ فیہ (انّ ابی و اباک فی النّار) یقیناً منکر حدیث ہے اور صحیح مسلم میں بہت ایسی احادیث ہیں جو از قبیل منکرات ہیں۔" (الرسائل التسع للسیوطی، رسالہ: التعظیم والمنۃ، ص ۴۰-۴۱)

ناظرین نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ علامہ ابن جوزی نے مذکورہ بالا دونوں حدیثوں کو اُن کی شدت نکارت کی وجہ سے اپنی کتاب "موضوعات" میں جگہ دی ہے جو موضوع احادیث کا مجموعہ ہے۔ حدیث زیر بحث بھی علامہ سیوطی کی تحقیق کے مطابق بالیقین منکر حدیث ہے اس لئے یہ بھی

موضوع قرار پاتی ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ حماد بن سلمہ کی اس حدیث کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں جگہ نہیں دی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ سیوطی تو یہاں تک لکھتے ہیں "وتسکت البخاری عنہ ولم یخرج لہ شیئاً فی صحیحہ" یعنی امام بخاری نے حماد بن سلمہ کی احادیث قبول نہیں اور اپنی صحیح میں اُن کی بیان کردہ احادیث کی تخریج نہیں کی۔ (الرسائل التسع للسیوطی رسالہ التعظیم والمنۃ اص ۴۰)

اُصول درایت کے معیار پر اس حدیث پر نقد و تبصرہ

حمّاد بن سلمہ نے ثابت کے واسطہ سے حضرت انسؓ سے جو حدیث مرفوعاً روایت کی ہے اُس سے بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے الفاظ "انّ ابی واباک فی النّار" (یعنی میرا باپ اور تیرا باپ دونوں دوزخی ہیں) خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ ہیں لیکن دیگر راوی جو حمّاد کے مقابلہ میں زیادہ معتبر اور ثقہ ہیں اُن سے یہ الفاظ منقول نہیں۔ چنانچہ معمّر نے اسی سند سے یعنی بواسطہ ثابت حضرت انسؓ سے حضور صلعم کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

اذا مررت بقبر کافر فبشرہ بالنار" یعنی جب تیرا کسی کافر کی قبر پر گزر ہو تو اُس کو دوزخ کی بشارت دیدینا۔ اس کے بعد علامہ سیوطی لکھتے ہیں:-

"وھذ اللفظ لا دلالۃ فیہ علی والدہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

بامرہ البتۃ، وھو اثبت من حیث الروایۃ، فان معمراً لم یتکلم فی حفظہ ولا استنکر شیٔ من حدیثہ، واتفق علی التخریج لہ شیخان"

(ترجمہ) اور حدیث کے یہ الفاظ وہ ہیں جو خصوصیت کے ساتھ پیغمبر اسلام کے والد ماجد کی طرف اشارہ نہیں کرتے۔ اور ان الفاظ کا راوی معمر باعتبار روایت حماد کے مقابلہ میں زیادہ معتبر اور زیادہ قوی ہے کیونکہ نہ تو اس کے حافظہ میں کسی نے کلام کیا اور نہ اس کی بیان کردہ احادیث میں منکرات نے دخل پایا اور اسی وجہ سے امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے اپنے اپنے مجموعۂ حدیث میں اس کی بیان کردہ احادیث کو جگہ دی ہے۔

(الرسائل التسع للسیوطی، رسالہ التعظیم والمنۃ، ص ۴۲)

معمر والی حدیث کی تائید حضرت سعد ابن وقاص رضؓ کی بیان کردہ حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ سیوطی لکھتے ہیں:

"بزار، طبرانی اور بیہقی نے ابراہیم بن سعد کے طریق سے بحوالہ زہری اور عامر بن سعد یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت سعد ابن وقاص رضؓ نے بیان کیا: ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرا باپ کہاں ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ دوزخ میں ہے۔ اعرابی نے کہا کہ آپ کے والد کہاں ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

"حیثما مررت بقبر کافرٍ فبشّرہ بالنار یعنی جب بھی تیرا کسی کافر کی قبر پر سے گزر ہو تو اُسے بشارت جہنم دیدیا کر"

(الرسائل التسع للسیوطی، رسالہ مسالک الحنفا ئص ۵۵) اس کے بعد علامہ سیوطی تحریر فرماتے ہیں:۔

"وھذا اسناد علی شرط الشیخین، فتعیّن الاعتماد علی ھذا اللفظ وتقدیمہ علی غیرہ (الضاً ص ۵۶)۔ یعنی حدیث کا یہ متن امام بخاری اور امام مسلم کی شرائطِ قبولِ حدیث پر پورا اترتا ہے اس لئے حدیث کے یہ الفاظ "جب بھی تیرا گزر کسی کافر کی قبر پر ہو تو اُسے جہنم کی بشارت سُنا دیا کر" قابل اعتماد قرار پاتے ہیں اور حماد والی حدیث کے الفاظ پر ان کو ترجیح حاصل ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ "انّ ابی وا باک فی النار" رسول اللہ صلعم کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ راوی نے اپنے الفاظ میں قول رسول "اذا مررت بقبر کافرٍ فبشّرہ بالنار" کے جو معنی سمجھے اُن کو ان الفاظ میں ادا کر دیا۔ اصطلاحی الفاظ میں اس مطلب کو یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ حدیث کا فقرہ "انّ ابی وا باک فی النار" (میرا باپ اور تیرا باپ دونوں دوزخ میں ہیں) لفظاً وارد نہیں ہوا ہے بلکہ راوی نے اس کو معناً بیان کیا ہے۔ علامہ سیوطی اس ضمن میں لکھتے ہیں:۔

"لیس روایۃ باللفظ بل رواھا الراوی بالمعنی فوھم

ذلک" یعنی یہ روایت باللفظ وارد نہیں ہوئی ہے بلکہ راوی حدیث نے اس کا مطلب بیان کیا ہے جس میں اُس کو وہم ہو گیا۔

(الرسائل التسع للسیوطی، رسالہ التعظیم والمنۃ، ص ۱۴۱)

ایک اعتراض اور اُس کا جواب

معمّر والی مذکورہ بالا حدیث پر ایک معترض یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ اعرابی نے آنحضرت صلعم سے صاف طور سے یہ سوال کیا تھا کہ آپ کے والد کہاں ہیں۔ اس کا صاف وصریح جواب دینے کی بجائے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے یہ مُبہم اور ذومعنی جواب کیوں دیا کہ جب بھی تیرا گزر کسی کافر کی قبر پر ہو تو اُس کو جہنم کی بشارت دیدیا کر؟ بے شک اس جواب میں حضرت عبداللہ کے نام کی صراحت نہیں ہے اور اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا اطلاق حضرت عبداللہ پر نہیں ہوتا لیکن اعرابی کے سوال کے سیاق کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس جواب کا تعلق حضرت عبداللہ سے ہے۔

علامہ سیوطی نے اس اعتراض کا جو جواب دیا ہے اُس کا اُردو ترجمہ ہم ہدیہ قارئین کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

" اس جواب میں حضور صلعم نے ایہام اور توریہ سے کام لیا ہے اور وہ اس طرح کہ اس میں آپ نے اس کی کھلے طور پر تصریح نہیں فرمائی کہ آپ کے والد ماجد دوزخ میں ہیں بلکہ صرف یہ ارشاد فرمایا کہ

"جب بھی تیرا گزر کسی کافر کی قبر پر ہو تو اس کو دوزخ کی بشارت دیدینا" اس جملہ سے آپ کے والد کے دوزخی ہونے کی خبر نہیں ملتی۔ البتہ قرینہ اور سلیقۂ کلام کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اس جملہ کا اطلاق آنحضرت صلعم کے والد پر بھی ہوتا ہے اور توریہ کی یہی صفت ہوتی ہے حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس خطرہ کے پیش نظر کہ سائل جو ایک بادیہ نشین عرب تھا کہیں مرتد نہ ہو جائے ایک طرف تو یہ پسند نہیں کیا کہ اس کو یہ بتلا دینے کے بعد کہ تیرا باپ دوزخ میں ہے) حقیقت حال سے صاف صاف آگاہ کیا جائے (کہ میرے والد عبداللہ جنت میں ہیں) اور دوسری طرف یہ بھی پسند نہیں فرمایا کہ جو مقام اُن کے والد کا ہے یعنی جنت اُس کے خلاف کچھ کہا جائے کیونکہ انسانی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ اُس کو اپنے یا اپنے اعزا کے مقابلہ میں دوسرے کو ترجیح دینا شاق گزرتا ہے (الرسائل التسع للسیوطی، رسالۃ التعظیم والمنۃ، ص ۴۲)

علامہ سیوطی نے مذکورہ بالا اعتراض کا جواب تو دیا لیکن اُس سے ایک اور اُلجھن پیدا ہو گئی اور وہ یہ کہ کیا کلام موری یعنی ایسا کلام جس میں توریہ سے کام لیا گیا ہو جس کا ایک مفہوم قائل کے ذہن میں ہو اور دوسرا مفہوم سامع نے سمجھا ہو کذب کی تعریف میں نہیں آتا اگر ایسے کلام پر کذب کا اطلاق ہوتا ہے تو پھر کیا اس انداز

سے کلام کرنا منافی شان رسالت نہیں ؟ یہ ایک زبردست الجھن ہے اور مناسب ہوگا اگر آگے بڑھنے سے پہلے اس کو دور کر دیا جائے۔

یہ الجھن کذب کا صحیح مفہوم پیش نظر نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ کِذب صدق کی ضد ہے۔ صدق کی تعریف علامہ بیضاوی نے ان الفاظ میں کی ہے " الصدق الاخبار المطابق اعتقاد المخبر" یعنی صدق اُس خبر کو کہتے ہیں جو خبر دینے والے کے اعتقاد کے مطابق ہو (تفسیر بیضاوی جلد ۱، ص ۳۲ مطبوعہ مصر ۱۲۵۸ھ)۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ کذب اُس خبر کو کہتے ہیں جو خبر دینے والے کے یقین و اعتقاد کے مطابق نہ ہو۔ کلام موّری کذب نہیں ہو سکتا کیونکہ جس مفہوم کو متکلم اپنے ذہن میں رکھ کر کلام کرتا ہے وہ کلام اُس کے مفہوم سے مطابقت رکھتا ہے۔ سامع کا دوسرا مفہوم سمجھ لینا اُس کو کذب میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ اسی لئے حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ " اِنَّ فی المعاریض لمندوحۃ عن الکذاب" یعنی کلام موّری میں کذب کی گنجائش نہیں۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۴، ص ۱۲)۔ حدیث کے فقرہ " حیثما مررت بقبر کافر فبشرہ بالنار" میں حضور صلعم نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ اُن کے اعتقاد کے مطابق ہے۔ اگر اعرابی نے اس کا یہ مفہوم سمجھ لیا کہ اس میں حضرت عبداللہ کے دوزخی ہونے کی خبر دی جا رہی ہے تو اُس کے ایسا سمجھ لینے سے حضور صلعم کا ارشاد

کذب قرار نہیں پا سکتا۔ مصالح دینی و شرعی کے موقع پر کلام موڑی کی مذکورہ بالا حدیث صحیح کی روشنی میں رخصت پائی جاتی ہے۔

مذکورہ بالا حدیث معمّہ ہی کلام موڑی کی منفرد مثال نہیں تاریخ میں اور بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں آنحضرتؐ اور آپ کے اصحاب نے توریہ کیا ہے۔ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے پیغمبر اسلام اپنے دو صحابیوں کے ساتھ لشکر قریش کی خبر معلوم کرنے میدان بدر میں گشت کرنے نکلے۔ ایک شخص سفیان سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے اُس سے لشکر قریش اور لشکر محمدؐ کی خبر پوچھی۔ اُس نے کہا کہ میں تمہارے سوال کا اُس وقت جواب دونگا جب تم مجھے یہ بتلا دوگے کہ تم کون ہو؟۔ آپ نے فرمایا: ہم اُس وقت تبلائیں گے۔ جب پہلے تم ہمارے سوال کا جواب دیدو گے۔ سفیان نے کہا میں نے سُنا ہے کہ محمّد فلاں دن اپنا لشکر لیکر نکلے ہیں۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو وہ آج اسی جگہ ہونے چاہئیں۔ اور قریش فلاں روز مکہ سے چلے ہیں۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو اُن کا لشکر آج فلاں جگہ ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد سفیان نے پوچھا کہ تم لوگ کون ہو۔ آنحضرت صلعم نے اس مصلحت سے کہ کہیں دشمن کو اُن کی خبر نہ مل جائے جواب میں ارشاد فرمایا: "نحن من الماء" (ہم پانی سے ہیں)۔ صاحب سیرۃ الحلبیہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے یہ جملہ بطور توریہ ارشاد فرمایا۔ آپ کا اس سے یہ مطلب تھا کہ ہم لوگ ماء دافق یعنی مادہ تولید سے پیدا ہوئے ہیں اور سفیان نے یہ سمجھا کہ

یہ لوگ عراق کے رہنے والے ہیں کیونکہ پانی کی کثرت کی وجہ سے اہل عراق کو "اہل الماء" کہا کرتے تھے (سیرۃ الحلبیہ جلد ۱، ص ۵۳۶)۔

اسی طرح ہجرت کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے توریہ کیا روضۃ الاحباب میں ہے کہ حضور صلعم اور حضرت ابوبکرؓ ایک ہی اونٹ پر سوار چلے جاتے تھے۔ ابوبکرؓ سے لوگ واقف تھے کیونکہ وہ بارہا بسلسلہ سفر اُدھر سے گزرے تھے۔ جب کوئی شخص آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں اُن سے دریافت کرتا کہ یہ کون ہے تو وہ توریۃ کہتے: ھٰذا الرجل یھدینی السبیل" یعنی یہ شخص مجھے راستہ بتلاتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کا اس سے یہ مقصد ہوتا کہ یہ مجھے راہ و خیر و ثواب کی ہدایت کرتا ہے اور سائل یہ سمجھتا کہ یہ اُن کے رہنمائے سفر ہیں۔

(روضۃ الاحباب جلد ۱، ص ۱۳۳، مطبع انوار محمدی)

مناسب ہوگا اگر اس سلسلہ میں ہم مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم کے افادات بھی ہدیہ ناظرین کردیں۔ وہ سورۃ الصافات کی آیت "انی سقیم" کی تفسیر کے بعد تنبیہ کے تحت لکھتے ہیں:-

"تقریر بالا سے ظاہر ہوگیا کہ حضرت ابراہیمؑ کا اِنّی سقیمٌ کہنا مطلب واقعی کے اعتبار سے جھوٹ نہ تھا۔ ہاں مخاطبین نے جو مطلب سمجھا اُس کے اعتبار سے خلاف واقعہ تھا۔ اسی لئے بعض احادیث میں اس پر لفظ کذب کا اطلاق کیا گیا ہے۔ حالانکہ فی الحقیقت یہ کذب نہیں بلکہ "توریہ" ہے۔ اور اس طرح کا توریہ مصلحت شرعی کے

وقت مباح ہے۔ جیسے حدیث ہجرت میں "مِمَّن الرجل" کے جواب میں آنحضرت صلعم نے فرمایا "من الماءِ" اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک سوال کے جواب میں کہا "رجل" یھدینی السبیل" (تفسیر قرآن بر حاشیہ قرآن مترجمہ مولانا محمود الحسن صاحب، ص ۵۸۳، نوٹ ا)

آنحضرت صلعم کا یہ جواب دینا کہ "نحن من الماءِ" غزوۂ بدر کا واقعہ ہے۔ علامہ موصوف نے غالباً سہواً اس واقعہ کو ہجرت کا واقعہ بیان کر دیا۔

(۴) حدیث چہارم متعلق بہ احیائے ابوین آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نقد و تبصرہ

چوتھی قسم احادیث جو حضرت عبداللہ کے مشرک ہونے پر دلالت کرتی ہیں اُن احادیث پر مشتمل ہے جو "حدیث احیاء" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان میں سے بعض حدیثوں میں حضرت آمنہ والدۂ آنحضرت صلعم کے اور بعض میں اُن کے والدین کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دُعا کے بدولت دوبارہ زندہ ہونے، مسلمان ہونے اور پھر مرجانے کا ذکر ہے۔ ان میں سے زیادہ مشہور وہ حدیث ہے جو خطیب بغدادی نے حضرت عائشہ رضہ سے نقل کی ہے اور جس کا متن یہ ہے: حضرت عائشہ رضہ

فرماتی ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے ساتھ حجۃ الوداع ادا کیا۔ جب آپ عقبۂ حجون پر پہونچے تو مغموم ومحزون ہوئے ہوئے اور رونے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رونے کی وجہ سے میں بھی رونے لگی۔ پھر آپ کو دکر اونٹ پر سے اُتر آئے اور مجھ سے فرمایا:

اے حمیرا! اسی پر بیٹھی رہنا۔ چنانچہ میں اونٹ پر ہی بیٹھی رہی اور آپ کہیں چلے گئے اور کافی عرصہ تک وہاں رہے۔ پھر آپ فرحاں وشاداں اور مسکراتے ہوئے واپس لوٹے۔ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ آپ میرے پاس سے اس حالت میں تشریف لے گئے تھے کہ آپ محزون ومغموم تھے اور گریہ فرما رہے تھے اور میں بھی آپ کو دیکھ کر رونے لگی تھی اور اب آپ لوٹے ہیں تو اس طرح کہ مسکرا رہے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا: میں اپنی والدہ کی قبر پر گیا تھا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ اُن کو زندہ کردے اللہ نے میری دُعا قبول کی اور اُن کو زندہ کردیا۔ پھر میری والدہ مجھ پر ایمان لائیں۔ اس کے بعد پھر خدا نے انھیں موت دیدی"

(الرسائل التسع للسیوطی، رسالہ دلشر العلمین المنیفین، ص ۶۷)۔

علامہ ابوالقاسم سہیلی نے اپنی کتاب الروض الانف میں حضرت عائشہ رض سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلعم نے اپنے

رب سے اپنے والدین کے زندہ کئے جانے کے لئے دعا کی۔ اللہ نے اُن دونوں کو زندہ کیا۔ وہ آپ پر ایمان لائے اور اس کے بعد اللہ نے اُن کو پھر موت دیدی۔ (الرسائل التسع للسیوطی، رسالہ "نشر العلمین المنیفین" ص ۱۱)۔

ان احادیث اور ان کے علاوہ اس موضوع پر جتنی حدیثیں منقول ہیں اُن کے بارے میں مُلّا علی قاری اپنی مشہور کتاب "موضوعات کبیر" میں لکھتے ہیں:۔

حدیث احیاءِ ابویہ علیہ السلام موضوع کما قال ابن وحیۃ (موضوعات کبیر مع اُردو ترجمہ ص ۹۸، مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین کا زندہ ہونا۔ یہ حدیث موضوع ہے جیسا کہ ابن وحیہ کا قول ہے۔

ان احادیث کے موضوع قرار دینے میں ملا علی قاری ہی منفرد نہیں ہیں بلکہ اور علمائے اعلام بھی شامل ہیں۔ سیوطی لکھتے ہیں کہ ائمہ حدیث میں سے جو لوگ ان کو موضوع قرار دیتے ہیں وہ دارقطنی، جوزقانی، ابن ناصر، ابن جوزی اور ابن وحیۃ ہیں۔ (الرسائل التسع للسیوطی، رسالہ "التعظیم والمنۃ" ص ۱۹-۲۰) پھر اسی سلسلہ میں علامہ سیوطی رقمطراز ہیں: لیکن جو علماء ان احادیث کی وضعیّت کے قائل نہیں اور ان کو محض ضعیف احادیث بتلاتے ہیں وہ خطیب بغدادی، ابن عساکر سہیلی، قرطبی، محب طبری اور ابن سید الناس ہیں۔ خود علامہ سیوطی ان

احادیث کے ضعیف ہونے کے قائل ہیں اور انھوں نے اس سلسلے میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے "نشر العلمین المنیفین فی احیاء الابوین الشریفین"۔ بہرکیف اس بحث سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین کے زندہ ہو کر ایمان لانے کے متعلق کوئی صحیح حدیث وارد نہیں ہوئی ہے۔

اب غور طلب چیز یہ ہے کہ علامہ سیوطی نے احادیث احیائے اَبَوین آنحضرت صلعم کو موضوع کیوں تسلیم نہیں کیا اور ان کے ضعیف ہونے پر انہیں کیوں اصرار ہے؟ یہ بات اُس وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب حدیثِ موضوع اور حدیثِ ضعیف کا فرق معلوم ہو جائے۔ واضح ہو کہ حدیث موضوع اُس کو کہتے ہیں جس کی کوئی اصل نہ ہو یعنی جس کو رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہی نہ ہو اور وہ افتراءً آپ سے منسوب کی گئی ہو۔ برخلاف اس کے حدیثِ ضعیف اُس کو کہتے ہیں جس کی کچھ اصل ہو یعنی جس کو آنحضرت ختمی مرتبت علیہ السلام نے فرمایا تو ضرور ہو لیکن اُس کا تسلی بخش ثبوت نہ ملتا ہو۔ علامہ سیوطی کا حدیث احیاءِ ابوین آنحضرت صلعم کے ضعیف ہونے پر زور دینے کا یہ مطلب ہے کہ اُن کے نزدیک اس حدیث کی اصل ضرور ہے یعنی حضور صلعم نے اپنے مشرک والدین کو زندہ کیا۔ پھر اُنہیں دعوت دین دیکر مسلمان کیا اور پھر وہ مر گئے لیکن اُن کے نزدیک اس کا تسلی بخش ثبوت نہیں۔

اب قابل غور چیز یہ ہے کہ آیا یہ ممکن بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے یہ حدیث ارشاد فرمائی ہو۔ظاہر ہے کہ یہ حدیث آپ اُسی وقت ارشاد فرما سکتے ہیں جبکہ وہ واقعہ جس کا اس میں ذکر ہے آپ کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوا ہو۔ اور آپ کے ہاتھوں اس واقعہ کا وقوع پذیر ہونا اُسی صورت میں ممکن ہے جب اس سے قرآن کی مخالفت نہ ہوتی ہو۔ اب اگر ہم آپ کے والدین کو کافر یا مشرک تسلیم کرتے ہیں تو اُن کے زندہ کئے جانے کی دُعا کرنا، پھر اُن کو دعوتِ دین دیکر مسلمان بنانا صاف طور سے اُن کی شفاعت کرنے کے مُترادف ہے تاکہ اُن کی نجات ہو جائے اور قرآن کی روشنی میں یہ ناممکن ہے۔ ابتدا اسلام میں ہی صاف الفاظ میں یہ بتلا دیا گیا تھا کہ جن لوگوں کا خاتمہ حالت کفر و شرک میں ہو گا اُن کے بارے میں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کچھ فائدہ نہیں دیگی۔ چنانچہ سورہ مُدثر میں کھُلے الفاظ میں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے کہ "فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ" یعنی ایسے لوگوں کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کوئی فائدہ نہیں پہونچائے گی۔ اگر واقعی آپ کے والدین کافر یا مشرک تھے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مذکورہ بالا آیۂ قرآنی کے ہوتے ہوئے یہ جسارت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ اپنے والدین کی مذکورہ بالا طریقہ سے شفاعت کریں اور جب حضور صلعم کے ہاتھوں اس واقعہ کا وقوع پذیر ہونا ہی ناممکن قرار پاتا ہے تو حدیث احیائے ابوین کا ارشاد فرمانا بھی ناممکن ہو جاتا ہے اور

اس طرح اس حدیث کی کوئی اصل نہیں رہتی اور یہ حدیث ضعیف نہیں بلکہ واضح طور پر موضوع ثابت ہوتی ہے۔

باب سوم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کے مذہب کے بیان میں

حضرت آمنہ کا نسب یہ ہے: آمنہ بنت وھب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب بن مُرّہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر (سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ ص ۱۵۲ اردو ترجمہ) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کلاب بن مُرّہ پر پہونچکر جناب آمنہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سلسلۂ نسب ایک ہوجاتا ہے۔ ان کی شادی جناب عبد اللہ ابن حضرت عبد المطلب کے ساتھ ہوئی اور اُن ہی کے بطن مبارک سے جناب سرور کائنات، مفخر موجودات علیہ افضل التحیات والصلوات پیدا ہوئے۔ جناب عبد اللہ اور جناب آمنہ دونوں شباب کے عالم میں حضرت عبد المطلب کی زندگی ہی

میں رہگرائے عالم بقا ہوئے۔ واقدی کے قول کے مطابق جناب عبد اللہ نے ۲۵ سال کی عمر میں وفات پائی اور ان کے انتقال کے چھ سال بعد کم و بیش اسی عمر میں حضرت آمنہ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ (الرسائل التسع للسیوطی، رسالۂ التعظیم والمنة، ص ۴۵) چونکہ دونوں بزرگواروں نے عین شباب میں انتقال کیا اس لئے تفصیل کے ساتھ ان کے حالات زندگی نہیں ملتے۔

بہر کیف کتب سیر و تواریخ کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جناب آمنہ موحدہ اور دین ابراہیمی کی پیرو تھیں۔ اس قول کی تائید اُس مسلمہ روایت سے ہوتی ہے جو جناب آمنہ سے منقول ہے۔ وہ فرماتی ہیں: میں حاملہ ہوئی لیکن وضع حمل کے وقت تک نہ مجھے کسی قسم کی گرانی محسوس ہوئی اور نہ تکلیف۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ میں حمل سے ہوں۔ ایام حمل میں ایک رات جبکہ میں کچھ سوتی تھی اور کچھ جاگتی تھی ایک فرشتہ آیا اور کہنے لگا کہ آیا تجھکو معلوم ہے کہ تو اس قوم کے سردار اور نبی کا بار اپنے شکم میں اٹھائے ہوئے ہے۔ اتنا کہکر وہ فرشتہ چلا گیا۔ جب وضع حمل کا وقت قریب آیا تو وہ فرشتہ پھر نمودار ہوا اور کہنے لگا: جب یہ بچہ پیدا ہو تو یہ کہنا کہ میں ہر حاسد کے شر سے اس کو خدائے واحد و یکتا کی پناہ میں دیتی ہوں۔ اور اس کا نام محمدؐ رکھنا"۔ اس روایت میں جو امام زہری سے منقول ہے فرشتہ کے نزول کا وقت متعین نہیں ہے لیکن علامہ

قسطلانی نے مواہب اللدنیہ میں حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے جو روایت نقل کی ہے اُس میں صاف طور سے درج ہے کہ اِنَّ مجیّ الملک لھا کان بعد ان مضٰی من حملھا ستۃ اشھر یعنی جناب آمنہ کے پاس فرشتہ کے آنے کا واقعہ اُس زمانہ میں ہوا کہ جب اُن کے حمل کو چھ مہینے گزر گئے تھے۔ (سیرۃ الحلبیہ، جلد ۱، ص ۴۷-۵۷)۔

جناب آمنہ کے پاس فرشتہ کا نازل ہونا اور اُنہیں یہ تبلانا کہ تم اپنے بچّہ کا نام محمد رکھنا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ آپ موحّدہ اور دینِ ابراہیمی کی پیرو تھیں کیونکہ قرآن پاک میں ہمیں صاف طور سے یہ خبر دی گئی ہے کہ نزولِ ملائکہ اُن ہی مومنین پر ہوتا ہے جو حق سبحانہ تعالیٰ کو اپنا رب جانتے ہیں اور اس عقیدہ توحید پر تادمِ مرگ قائم رہتے ہیں۔ چنانچہ ارشادِ رب العزت ہے:

اِنّ الّذین قالوا ربّنا اللّٰہ ثمّ استقاموا تتنزّل علیھم الملٰئکۃ الّا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنّۃ الّتی کنتم توعدون ۝ نحن اولیٰؤکم فی الحیٰوۃ الدّنیا وفی الآخرۃ۔ (سورہ حٰم سجدہ، آیات ۲۹-۳۰)

بہ تحقیق جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہی ہے اور اس عقیدہ پر قائم رہتے ہیں اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور اُنہیں یہ خوشخبری دیتے ہیں کہ نہ تو ہونے والے واقعات سے ڈرو اور نہ گزشتہ واقعات سے غمگین ہو بلکہ اُس جنت کی بشارت سے خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ

کیا گیا ہے۔ ہم اس حیات دنیوی
میں بھی تمہارے ولی اور دوست
ہیں اور آخرت میں بھی ولی اور
دوست رہیں گے۔

ممکن ہے کہ اس مقام پر کسی کو یہ اشکال پیدا ہو کہ تفاسیر کے دیکھنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ صدر آیات میں مومنین پر موت کے وقت فرشتوں کے نازل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ زندگی میں فرشتوں کا نازل ہونا کہاں سے آ گیا۔ تو بے شک تفاسیر میں یہ بھی اقوال ملتے ہیں کہ فرشتے موت کے وقت مومنین پر نازل ہوتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ ایسے بھی اقوال منقول ہیں کہ زندگی میں بھی مومنین پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور یہ قول قرآنی سیاق سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے کیونکہ اگلی ہی آیت میں فرشتوں کا یہ قول ملتا ہے کہ ہم اس دنیا میں بھی تمہارے دوست اور ولی بنکر رہے ہیں اور آخرت میں بھی رہیں گے۔ چنانچہ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

"بہت ممکن ہے کہ متقین اور ابرار پر اس دنیوی زندگی میں بھی ایک قسم کا نزول فرشتوں کا ہوتا ہو جو اللہ کے حکم سے اُن کے دینی اور دنیوی اُمور میں بہتری کی باتیں الہام کرتے ہوں جو اُن کے شرح صدر اور تسکین و اطمینان کا باعث ہو جاتا ہو۔ بہر حال بعض مفسرین

کے نزدیک یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں اور اس تقدیر پر اگلی آیت "نحن اولیاء کم فی الحیوٰۃ الدنیا" زیادہ چسپاں ہوتی ہے"

(حاشیہ بر قرآن مترجمہ مولانا محمود الحسن صاحب ص ۶۲۲)

اس روایت کے سلسلہ میں ایک اور اشکال پیدا ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جناب آمنہ غیر نبی تھیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ غیر نبی کے پاس بھی فرشتہ نازل ہو؟ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہمیں صاف طور سے یہ خبر دی گئی ہے کہ پیغمبر ہمیشہ طبقۂ رجل میں سے ہی مبعوث ہوئے ہیں۔ چنانچہ سورۂ یوسف میں ارشاد رب العزت ہے:۔

وما ارسلنا من قبلك الّا رجالاً نوحی الیھم من اھل القریٰ ط (سورۂ یوسف آیۃ ۱۰۹)

اے پیغمبر! ہم تم سے پہلے بھی قریوں کے رہنے والے لوگوں میں سے صرف مردوں کو رسول بنا کر بھیجتے رہے ہیں جن کے پاس ہم وحی بھیجتے تھے۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

"یخبر تعالیٰ انه انما ارسل رسله من الرجال لا من النساء وھذا قول جمھور العلماء" یعنی اس آیت میں حق سبحانہ تعالیٰ یہ خبر دیتا ہے کہ اُس نے محض طبقۂ رجل میں سے انبیاء بنا کر بھیجے ہیں۔ طبقۂ نسوان میں سے کسی کو نبی یا رسول نہیں بنایا اور جمہور علماء کا یہی قول ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲، ص ۴۹۶)۔ اس سے یہ بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ جناب

مریم مادر جناب حضرت عیسیٰؑ نبی نہیں تھیں۔ لیکن نبی نہ ہونے کے باوجود اُن کے بارے میں قرآن کریم میں یہ ارشاد ہے:۔

فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ہ (سورہ مریم، آیت ۱۷)

یعنی ہم نے اپنی روح (جبرئیل) کو اُن کے پاس بھیجا جو اچھے خاصے آدمی کی صورت بن کر اُن کے (مریم کے) سامنے آ کھڑا ہوا۔

جناب مریم مادر جناب عیسیٰ غیر نبی تھیں۔ جب اُن کے سامنے فرشتہ بہ شکل انسانی آسکتا ہے تو جناب آمنہ مادر جناب محمد مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے فرشتہ کے آنے میں کونسے تعجب کی بات ہے۔

ایک اعتراض اور اُس کا جواب

اس روایت کے سلسلہ میں ایک اعتراض وارد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب آمنہ نے آنحضرت صلعم کا نام محمدؐ رکھا اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق مشہور قول یہ ہے کہ ولادت کے ساتویں روز جناب عبدالمطلب جدّ نامدار جناب رسول مختار نے آپ کا عقیقہ کیا اور اُسی روز اُنھوں نے آپ کا نام محمد رکھا۔ (سیرۃ الحلبیہ جلد ۱، ص ۷۵)۔ ان دونوں روایتوں میں تطبیق کیونکر ممکن ہے؟ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ابن عباس والی مذکورہ صدر روایت سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ اہل عرب میں یہ دستور تھا کہ بچہ کی ولادت کے

ساتویں روز اُس کا عقیقہ کرتے تھے اور اُسی روز اُس کا نام رکھتے تھے۔ اب مقریزی نے اپنی مشہور کتاب اُمتاع، میں ایک روایت درج کی ہے جس کا ترجمہ ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں :۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سے تین سال قبل جناب عبد المطلب کے فرزند قثم کا بعمر نو سال انتقال ہوا جس کا اُن کو سخت صدمہ ہوا۔ جب آنحضرت صلعم پیدا ہوئے تو حضرت عبد المطلب نے اُن کا نام قثم رکھا۔ جب جناب آمنہ کو اس کی خبر ہوئی تو اُنھوں نے کہلا بھیجا کہ مجھے خواب میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس بچہ کا نام محمد رکھوں۔ چنانچہ جناب عبد المطلب نے آپ کا نام محمد رکھا" (سیرۃ الحلبیہ جلد ۱ ص ۷۶)۔ اس کے بعد صاحب سیرۃ الحلبیہ لکھتے ہیں :۔

"ولا مخالفۃ بین ھذہ الروایات علی تقدیر صحتھا کما لا یخفی لانہ یجوز ان یکون نسی تلک الرؤیۃ ثم تذکرھا"

ترجمہ :۔ اور ظاہر ہے کہ صحیح ہونے کی صورت میں ان روایات میں کوئی مخالفت و مُباینت نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے کہ جناب آمنہ اس خواب کو بھول گئی ہوں اور پھر (عقیقہ والے دن) اُن کو یہ واقع یاد آیا ہو۔ اس صورت میں دونوں روایتوں میں تطبیق بدیہی چیز ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے ظاہر ہے کہ جناب آمنہ پر فرشتہ کا نزول مستبعد نہیں بلکہ روایت مذکور الصدر کی روشنی میں یقینی ہے اور نزول فرشتہ آپ کے موحدہ اور پیرو دین ابراہیمی ہونے کا قوی ترین بلکہ قطعی

ثبوت ہے جیسا کہ ہم اوپر تحریر کر چکے ہیں۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اُس سے اُمّ سماعہ بنت ابی رھم والی روایت کو تقویت پہونچتی ہے جس سے جناب آمنہ کے موحدہ اور پیرو دین براہیمی ہونے کا مزید ثبوت ملتا ہے لیکن جس کو بعض علماء نے ضعیف روایت کہا ہے۔ اس روایت کو علامہ سیوطی نے اپنے رسالہ "مسالک الحنفاء" میں نقل کیا ہے۔ ہم اُن کی عبارت کا اُردو ترجمہ ہدیۂ قارئین کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

ابو نعیم نے اپنی کتاب "دلائل النّبوۃ" میں امام زہری کے طریق سے بواسطہ اُمّ سماعہ بنت ابی رھم روایت نقل کی ہے کہ ام سماعہ کی ماں نے بیان کیا: رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ آمنہ کی اُس علالت کے موقع پر میں موجود تھی جس میں اُن کا انتقال ہوا۔ اُس موقع پر جناب محمد مصطفیٰؐ جن کی عمر پانچ سال تھی اُن کے سرہانے کھڑے ہوئے تھے۔ یکایک آمنہ نے اُن کے چہرہ کی طرف نظر ڈالی اور یہ شعر پڑھنے لگیں۔

بارک اللّٰہ فیک من غلام — یا ابن الذی من حومۃ الحمام
نجا بعون الملک المنعام — فودی غداۃ الضرب بالسہام
بمائۃ من ابلٍ سوام — ان صحّ ما ابصرتُ فی المنام
فانت مبعوث الی الانام — من عند ذی الجلال والاکرام
تبعث فی الحلّ وفی الحرام — تبعث بالتحقیق والاسلام

دین ابیک البر ابراھام   فاللہ ینھاک عن الاصنام

ان لا توالیھا مع الاقوام

ترجمہ:۔ اے لڑکے، اے اُس باپ کے فرزند جو سردار اور شریف قوم تھا اور جس نے خدائے برتر واعلےٰ و صاحب جود و سخا کی مدد سے نجات پائی اور جس کے بدلے میں اُس روز صبح کر جب تیروں سے قرعہ اندازی ہوئی، ایک سو شریف النسل اونٹ فدیہ دئے گئے، خدا تجھے بابرکت کرے۔ جو کچھ میں نے خواب میں دیکھا ہے اگر وہ صحیح ہے تو تو خدائے ذوالجلال والاکرام کی طرف سے اہل عالم کے لئے نبی مبعوث ہوگا۔ تو حلّ و حرم میں نبی مبعوث ہوگا جو تیرے پاکباز جداعلیٰ حضرت ابراہیم کا دین تھا۔ اور اللہ تجھکو بتوں سے بچائے رکھے گا یعنی تو اصنام پرستی میں اقوام عرب سے دوستی و موالات نہیں رکھے گا۔

پھر جناب آمنہ نے فرمایا: ہر ذی روح کو مرنا ہے اور ہر حادث کو ناپید ہونا ہے۔ میں ضرور مر رہی ہوں لیکن میرا ذکر باقی رہے گا کیونکہ میں خیر محض کو چھوڑے جا رہی ہوں جس کو میں نے طیّب و طاہر جنا ہے۔ اس کے بعد وہ انتقال کر گئیں، (الرسائل التسع للسیوطی، رسالۂ مسالک الحنفاء ص ۴۶-۴۷)

اس کے بعد علامہ سیوطی لکھتے ہیں:۔

وانت تریٰ ھذا الکلام منھا صریحا فی النھی عن موالاۃ الاصنام مع الاقوام، والاعتراف بدین ابراھیم علیہ السلام،

وبعث ولدها الی الانام، من عند ذی الجلال والاکرام بالاسلام، وھذہ الالفاظ منافیۃ للشرک۔

(مسالک الحنفاء للسیوطی، ص ۴۷)

(ترجمہ) آپ دیکھتے ہیں کہ جناب آمنہ کے مذکورہ بالا کلمات صاف و صریح طور سے اقوام عرب کے ساتھ بت پرستی میں دوستی اور موالاۃ کرنے سے ممانعت کر رہے ہیں، دین ابراہیم علیہ السلام کے حق ہونے کا اعتراف کر رہے ہیں اور اپنے فرزند کے خدائے ذوالجلال والاکرام کی طرف سے دین اسلام کے ساتھ اہل عالم کی طرف مبعوث ہونے کی خبر دے رہے ہیں، اور یہ وہ کلمات ہیں جو اُن کی ذات سے شرک کی نفی کر رہے ہیں۔

ان روایات کو جب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس متفق علیہ حدیث کی روشنی میں دیکھتے ہیں جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ

لم یزل اللہ ینقلنی من اصلاب الطاھرۃ الی ارحام الطاھرات

یعنی اللہ تعالیٰ مجھ کو ہمیشہ پاک و پاکیزہ مردوں کی پشتوں سے طیب و طاہر عورتوں کے رحموں میں منتقل فرماتا رہا۔

تو پھر ان کی صحت میں شمہ برابر شک وشبہ باقی نہیں رہتا اور جناب آمنہ کا قطعیت کے ساتھ موحدہ اور پیرو دین ابراہیمی ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

اُن احادیث پر نقد و تبصرہ جو جناب آمنہ کے مشرکہ اور جہنّمی ہونے پر دلالت کرتی ہیں

اب ہم اُن احادیث کا جائزہ لیں گے جو جناب آمنہ کے مشرکہ اور جہنمی ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

حدیث اوّل۔ لَیْتَ شِعْرِی مَا فَعَلَ آبَوَای پر نقد و تبصرہ۔

اس حدیث پر ہم روایتہً اور درایتہً باب دوئم میں جو حضرت عبداللہ کے مذہب کے بارے میں ہے، تفصیلی بحث کر چکے ہیں اور وہاں ثابت کر آئے ہیں کہ یہ حدیث موضوع ہے اور اس لئے حضرت عبداللہ اور حضرت آمنہ کے مشرک ہونے پر یہ دلیل نہیں ہو سکتی۔ اس تمام بحث کے اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ قارئین کرام اس بحث کو باب دوئم میں ملاحظہ فرمالیں۔

حدیث دوئم۔ آنحضرت صلعم کو اپنی والدہ کے لئے استغفار کرنے کی اجازت نہ ملنے والی حدیث پر نقد و تبصرہ۔

یہ حدیث متعدد طرق سے وارد ہوئی ہے جن کا ترجمہ ہم ذیل میں ہدیۂ قارئین کرتے ہیں :-

(۱) امام حاکم نے مستدرک میں، واحدی نے اسباب النزول میں اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں ایوب بن ہانی کے طریقہ سے

بواسطہ مسروق حضرت عبداللہ ابن مسعود سے اس حدیث کو بیان کیا ہے۔ ہم تفسیر ابن کثیر سے ابن ابی حاتم والی حدیث کا ترجمہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔

ابن ابی حاتم اپنی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے میرے باپ نے، اُن سے خالد بن خداش نے، اُن سے عبداللہ بن وھب نے، اُن سے ابن جریج نے، اُن سے ایوب بن ہانی نے، اُن سے مسروق نے اور اُن سے عبداللہ ابن مسعود نے بیان کیا: ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبرستان کی طرف گئے، ہم بھی اُن کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ آپ ایک قبر پر پہونچکر بیٹھ گئے اور بہت دیر تک مناجات کرتے رہے۔ پھر آپ رونے لگے اور اُن کو دیکھ کر ہم بھی رونے لگے۔ پھر آپ قبر پر سے کھڑے ہو گئے۔ عمر ابن الخطاب اُن کی طرف بڑھے۔ آپ نے اُن کو بلایا اور پھر ہم کو بھی بلا لیا۔ اور دریافت کیا کہ تم لوگ کیوں روئے۔ ہم نے عرض کیا کہ آپ کے رونے کی وجہ سے ہم بھی رونے لگے تھے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ جس قبر پر میں بیٹھا تھا وہ آمنہ کی قبر تھی۔ میں نے اپنے رب سے زیارۃ قبر آمنہ کی اجازت مانگی تھی۔ اُس کی مجھے اجازت مل گئی۔ پھر میں نے اُن کے لئے استغفار کرنے کی اجازت مانگی مگر اس کی اجازت نہیں ملی۔

اور یہ آیت نازل ہوئی۔

ماکان النبی والذین اٰمنوا　　پیغمبر اور مومنین کے لئے یہ سزاوار

ان یستغفروا للمشرکین ولو کانوا اولی قربیٰ من بعد ما تبین لھم انھم من اصحٰب الجحیم (سورۂ توبہ آیت ۱۱۳)

نہیں کہ وہ مشرکین کے لئے استغفار کریں جبکہ اُن پر یہ واضح ہو چکا ہو کہ وہ اہل دوزخ سے ہیں۔

پس مجھ پر بھی وہی حالت طاری ہوئی جو ماں باپ کے لئے اولاد پر طاری ہوتی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد ۲، ص ۳۹۴)۔

نقد و تبصرہ:- اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد علامہ سیوطی لکھتے ہیں

ایوب ابن ھانی ضعفہ ابن معین، فھٰذہ علۃ تقدح فی صحتہ

یعنی اس حدیث میں ایوب ابن ہانی جو راوی ہے اُس کو ابن معین نے ضعیف بتلایا ہے۔ اور یہ وہ علت اور سُقم ہے جو صحت حدیث میں خلل انداز ہوتا ہے۔ (الرسائل التسع للسیوطی، رسالۃ التعظیم والمنۃ، ص ۱۸)

پس حدیث منع استغفار اُمّہ کے سلسلہ میں جو حدیث حضرت عبداللہ ابن مسعود سے منقول ہے وہ جناب آمنہ کے مشرکہ ثابت کرنے کے لئے ناکافی ہے۔

(۲) دوسری حدیث وہ ہے جو طبرانی نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔ ہم اس حدیث کے سند اور متن کا ترجمہ تفسیر ابن کثیر سے ہدیۂ قارئین کرتے ہیں:۔

امام طبرانی کہتے ہیں: "ہم سے محمد بن علی بن المروزی نے، اُن سے ابوالدرداء عبدالعزیز بن منیب نے، اُن سے اسحٰق بن عبداللہ بن کیسان نے

اُن سے اُن کے باپ نے، اُن سے عکرمہ نے اور اُن سے عبداللہ ابن عباسؓ نے بیان کیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے لوٹے تو آپ نے عمرہ ادا کیا۔ جب آپ عسفان کی گھاٹی سے اُترے تو آپؐ نے اصحاب کو حکم دیا کہ میرے لوٹنے تک عقبہ پر رُکے رہو۔ پس آپؐ تشریف لے گئے اور اپنی ماں کی قبر پر پہونچکر سواری سے اُتر پڑے پھر آپ نے کافی دیر تک مناجات کی۔ اس کے بعد آپ شدت سے رونے لگے اور اُن کو روتا دیکھ کر اصحاب بھی رونے لگے اور کہنے لگے اس مقام پر اللہ کے نبی کے رونے کا سبب یہ ہی ہو سکتا ہے کہ آپ کی اُمت کے لئے کوئی ایسا حکم نازل ہوا ہے جس کے بجالانے کی اُس میں طاقت نہیں۔ جب اصحاب رونے لگے تو نبی کریم قبر سے اُٹھے اور اُن کے پاس آکر کہنے لگے: تمہارے رونے کا کیا سبب ہے۔ انہوں نے عرض کیا ہم آپکو روتا دیکھ کر رونے لگے اور ہمیں یہ خیال گذرا کہ شاید آپ کی اُمت کے لئے کوئی ایسا حکم صادر ہوا ہے جس کے بجالانے کی اُس میں طاقت نہیں۔ آپ نے فرمایا: ایسا نہیں ہے بلکہ میں اپنی ماں کی قبر پر گیا تھا اور میں نے اللہ سے التجا کی تھی کہ وہ قیامت کے دن مجھے اُن کی شفاعت کی اجازت دیدے، مگر اللہ نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ پس چونکہ وہ میری ماں تھی اس لئے مجھے اُن کی حالت پر ترس آگیا۔ پھر جبرئیل نازل ہوئے اور انہوں نے آیہ ما کان للنبی والذین امنوا الخ کی تلاوت کی اور مجھ سے کہا کہ تم بھی اپنی ماں سے

اسی طرح بے تعلق ہو جاؤ جس طرح ابراہیم اپنے باپ سے بے تعلق ہو گئے تھے۔ پس مجھے اپنی ماں کی حالت پر رحم آگیا۔"

(تفسیر ابن کثیر، جلد ۲۔ ص ۳۹۴)

تبصرہ:۔ اس حدیث کے سلسلہ میں علامہ سیوطی لکھتے ہیں: "اسنادہ ضعیف"۔ (الرسائل التسع للسیوطی، رسالہ "التعظیم والمنۃ، ص ۱۸)۔

چونکہ علامہ سیوطی نے اختصار سے کام لیا ہے اس لئے ہم تفصیل سے بیان کریں گے کہ اس حدیث کی سند کس طرح ضعیف ہے۔

اس حدیث کے پہلے راوی محمد بن علی بن المروزی ہیں۔

ان کے بارے میں علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے اس نے ایسی حدیثیں روایت کی ہیں جن کی متابعت نہیں ہوتی۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ ان کی حدیث قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ذہبی کہتے ہیں: میں کہتا ہوں کہ اس کی حدیثیں قبول کرنے میں حرج ہی حرج ہے۔

(میزان الاعتدال للذہبی، جلد ۳۔ ص ۶۵۲-۶۵۳)

دوسرے راوی عبد العزیز بن منیب ہیں۔

میزان الاعتدال میں اس راوی کا ترجمہ نہیں ملتا۔

تیسرے راوی اسحٰق بن عبد اللہ بن کیسان المروزی ہیں۔

ذہبی کہتے ہیں کہ ابو احمد حاکم نے اس کو حدیث قبول کرنے میں نرم سمجھا ہے (لَيِّنُهُ) (میزان الاعتدال جلد ۱، ص ۱۹۴)

چوتھے راوی عبد اللہ بن کیسان المروزی ہیں۔

ان کے بارے میں ذہبی کہتے ہیں: امام بخاری کا قول ہے کہ یہ منکر الحدیث ہیں۔ ابو حاتم کا قول ہے کہ یہ ضعیف ہیں۔ امام نسائی کہتے ہیں کہ یہ قوی نہیں ہے۔ (میزان الاعتدال جلد ۴ ص ۴۷۵)۔

پانچویں:۔ راوی عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ ہیں۔
ان کے متعلق میزان الاعتدال ذہبی میں ہے۔

تکلم فیہ لرایہ لا لحفظہ، فاتھم برای الخوج (میزان جلد ۳، ص ۹۳)

جریر عن یزید ابن ابی زیاد عن عبد اللہ بن الحارث: دخلتُ علی علیّ ابن عبد اللہ (بن عباس) فاذا عکرمۃ فی وثاق عند باب الحش، فقلت لہ: الا تتقی اللہ! فقال: ان ھذا الخبیث یکذب علی ابی (میزان جلد ۳، ص ۹۴)۔ وعن ابن المسیّب قال لمولاہ بُرد: لا تکذب علیّ کما کذب عکرمۃ علی ابن عباس۔ (میزان جلد ۳، ص ۹۶-۹۷)

ترجمہ:۔ عکرمہ جو نظریہ رکھتا تھا اُس کی وجہ سے اس کی ثقاہت میں کلام ہے نہ کہ اُس کے حافظہ کی وجہ سے۔ یہ خوارج کا نظریہ رکھنے کی وجہ سے متہم ہے۔ جریر نے یزید ابن ابی زیاد سے روایت کی ہے کہ اُن سے عبد اللہ ابن الحارث نے کہا کہ میں ایک روز علی ابن عبد اللہ ابن عباس کے پاس گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ عکرمہ پاخانہ کے پاس رسّی سے بندھا کھڑا ہے۔ میں نے علی ابن عبد اللہ سے کہا کہ کیا تمہیں خدا کا خوف نہیں جو اس کا یہ حال کر رکھا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ خبیث میرے باپ

پر دروغ بافی کرتا ہے۔ سعید ابن المسیب سے منقول ہے کہ انھوں نے اپنے غلام بُرد سے کہا: دیکھو! مجھ پر اس طرح جھوٹ نہ بولنا جس طرح عکرمہ ابن عباسؓ پر جھوٹ بولا کرتا تھا۔

ظاہر ہے کہ جس حدیث کے راوی ضعیف، لین، منکر الحدیث، خارجی ذہنیت رکھنے والے اور کاذب ہوں اُس کا کیونکر اعتبار ہو سکتا ہے۔ یہ حدیث حضرت عبداللہ ابن عباسؓ پر دروغ و افترا ہے اور یہ حضرت آمنہ کے مشرکہ اور جہنمی ہونے کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔

(۳) تیسری حدیث وہ ہے جس کو صحابی رسول حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ سے منسوب کیا گیا ہے۔ امام احمد نے اپنے مُسند میں، ابن سعد نے طبقات الکبریٰ میں اور ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں اس حدیث کی تخریج کی ہے۔ یہ تمام حدیثیں متن کے اعتبار سے قریب قریب یکساں ہیں۔ ابن جریر طبری والی حدیث کا ترجمہ ہم تفسیر ابن کثیر سے نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

"علقمہ بن مرثد نے سلیمان بن بُریدہ سے اور سلیمان نے اپنے باپ بریدہؓ سے روایت کی ہے کہ اُنھوں نے فرمایا: جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ تشریف لائے تو آپ ایک مسمار قبر پر گئے اور اس پر بیٹھ گئے اور کچھ پڑھنے لگے۔ پھر آپ روتے ہوئے قبر پر سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم نے آپ کی حالت دیکھی۔ یہ

کیا بات تھی۔ فرمایا: میں نے اپنے رب سے اپنی ماں کی قبر کی زیارت کے لئے اجازت مانگی تھی جس کی اُس نے مجھے اجازت دیدی پھر میں نے اُس کی بخشش کے لئے استغفار کرنے کی اجازت چاہی لیکن اس کی مجھے اجازت نہیں دی۔ اُس روز سے زیادہ آنحضرت صلعم کو روتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲، ص ۳۹۳)

ابن سعد نے طبقات میں بُریدہ والی حدیث کو ان الفاظ سے شروع کیا ہے: "لمّا فتح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکۃ، اتیٰ قبراً فجلس الیہ الخ"

یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکّہ فتح کرلیا تو آپ ایک قبر پر آئے (الرسائل التسع، رسالۃ التعظیم والمنۃ ص ۱۹)

نقد و تبصرہ۔ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے: "ھٰذا غلط لیس قبرھا بمکّۃ وقبرھا بالابواء"

یعنی یہ حدیث غلط ہے کیونکہ جناب آمنہ کی قبر مکہ میں نہیں ہے بلکہ اُن کی قبر ابواء میں ہے (الرسائل التسع للسیوطی، رسالۃ التعظیم والمنہ، ص ۱۹) اور ابواء مدینہ منوّرہ کے قریب ایک گانوں ہے جس کے متعلق علامہ حلبی لکھتے ہیں: والابواء محلٌ بین مکّۃ والمدینۃ وھوالی المدینۃ اقرب۔

یعنی ابواء مکّہ اور مدینہ کے درمیان ایک گانوں ہے اور مکّہ کے مقابلہ میں مدینہ سے زیادہ قریب۔ (سیرۃ الحلبیۃ، جلد ۱، ص ۱۰۱)۔

پس بریدہ والی حدیث اپنے متن سے ہی غلط ثابت ہوتی ہے اور حضرت آمنہ کے مشرکہ ہونے کو ثابت کرنے کے لئے ناکافی ہے۔

(۴) حدیث منع استغفار کا چوتھا طریقہ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رض سے منقول ہے۔ ہم اس حدیث کا اردو ترجمہ مع سند و متن پیش کرتے ہیں۔ امام مسلم کہتے ہیں: ہم سے یحیٰی بن ایوب اور محمد بن عباد نے (حدیث کے الفاظ یحیٰی کے ہیں)، ان سے مروان ابن معاویہ نے، اُس سے یزید بن کیسان نے، اُس سے ابو حازم نے اور اُس سے ابوہریرہ رض نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے اپنی ماں کے لئے استغفار کرنے کی اجازت مانگی لیکن اُس نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی۔ پھر میں نے اپنی ماں کی قبر کی زیارت کرنے کی اجازت طلب کی تو اُس نے زیارت کی اجازت دیدی۔ (صحیح مسلم جلد ۱، ص ۳۸۹، کتاب الجنائز، باب استئذان النبیؐ ربہ عزوجل فی زیارۃ قبر اُمّہ)

نقد و تبصرہ: اب ہم اس حدیث کے راویوں کا جائزہ لیتے ہیں تاکہ اس کی صحت و سقم کا حال معلوم ہو سکے۔

(الف) پہلے راوی جن کے الفاظ میں یہ حدیث وارد ہوئی ہے یحیٰی بن ایوب ہیں۔ ان کے ترجمہ میں علامہ ذہبی لکھتے ہیں: ابن معین کہتے ہیں کہ ان کی حدیث لینے میں حرج نہیں۔ پھر دوسرے مقام پر ابن معین کہتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے (میزان الاعتدال جلد ۴ ص ۶۲)

(ب) دوسرے راوی مروان ابن معاویہ ہیں۔ ان کے متعلق علامہ ذھبی کہتے ہیں: یہ ثقہ، عالم اور صاحب حدیث ضرور ہیں لیکن ہر کرومہ سے حدیث روایت کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان کے شیوخ حدیث پر کافی غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔ (میزان الاعتدال، جلد ۴، ص ۹۳)

(ج) یزید ابن کیسان الیشکری الکوفی۔ ان کے متعلق میزان الاعتدال میں ہے: امام نسائی نے ان کو ثقہ بتلایا ہے۔ لیکن ابو حاتم کہتے ہیں! ان سے حجت پیش نہیں کی جاسکتی۔ یحیٰی بن سعید القطان کہتے ہیں: یہ صالح اور نیکوکار ضرور ہیں لیکن اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جن پر اعتماد کیا جا سکے۔ (میزان الاعتدال، جلد ۴، ص ۴۳۸۔۴۳۹)۔

(د) چوتھے راوی ابو حازم ہیں۔ معلوم نہیں یہ کون ہیں کیونکہ نہ ان کا نام حدیث میں درج ہے نہ ولدیت، نہ قبیلہ اور نہ سکونت۔ ظاہر ہے کہ جب حدیث کے رواۃ ضعیف، ہر کرومہ سے روایت بیان کرنے والے اور ناقابل اعتماد ہوں اُن کی بیان کردہ حدیث سے کسی واقعہ کی صحت کا کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے۔ پس یہ حدیث بھی حضرت آمنہ کے مشرکہ ثابت کرنے کے لئے ناکافی ہے۔

(۵) منع استغفار کے سلسلہ میں پانچویں حدیث بھی صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ سے منقول ہے۔ اُس کا ترجمہ حسب ذیل ہے!

امام مسلم لکھتے ہیں: ہم سے ابوبکر ابن ابی شیبہ اور زہیر بن حرب نے، ان دونوں سے محمد بن عُبید نے، اُس سے یزید بن کیسان نے،

اُس سے ابو حازم نے بیان کیا کہ حضرت ابو ہریرہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ماں کی قبر پر گئے، وہاں وہ رونے لگے اور اُن کو دیکھ کر اُن کے گرد و پیش جو لوگ تھے وہ بھی رونے لگے۔ پھر آپ نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے اجازت چاہی تھی کہ اپنی ماں کے لئے استغفار کروں مگر مجھے اجازت نہیں دی گئی۔ پھر میں نے اُن کی قبر کی زیارت کرنے کی اجازت طلب کی تو اس کی مجھے اجازت دیدی۔ اب تم قبروں پر جایا کرو کیونکہ یہ عمل موت کی یاد دلاتا ہے"

(صحیح مسلم جلد ۱، ص ۳۸۹)

اس حدیث کی بھی وہی حیثیت ہے جو حدیث نمبر (۲) کی ہے کیونکہ اس کے راویوں میں بھی یزید بن کیسان ہیں اور اُن کے بارے میں ہم اوپر نقل کر چکے ہیں کہ ان کی بیان کردہ احادیث قابل حجت نہیں اور یہ خود بقول یحییٰ بن سعید القطان قابل اعتماد نہیں۔

حدیث سوم ۔ حدیث "اُمّی مع اُمّکما" پر نقد و تبصرہ۔

اس حدیث کو علامہ سیوطی نے اپنے رسالہ "التعظیم والمنۃ" میں مع سند کے نقل کیا ہے۔ ہم اُس کا اُردو ترجمہ ہدیۂ قارئین کرام کرتے ہیں: وہ ابن شاہین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

ابن شاہین کہتے ہیں: ہم سے یحییٰ بن صاعد نے، اُن سے ابراہیم بن سعد اور زہیر بن محمد نے، اُن دونوں سے عبد الرحمٰن بن المبارک نے، اُس سے مصعب بن حرب نے بواسطۂ علی بن الحکم، اُس

سے عثمان بن عُمیر نے، اُس سے ابو وائل نے بواسطۂ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کیا کہ عبداللہ ابن مسعودؓ نے کہا: ملیکہ کے دو لڑکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہماری ماں مہمانوں کی ضیافت کیا کرتی تھی مگر اُس نے زمانۂ جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ دفن بھی کیا تھا۔ ہمیں خبر دیجئے کہ ہماری ماں کہاں ہے۔ آپ نے فرمایا: تمہاری ماں دوزخ میں ہے۔ یہ جواب اُن پر شاق گزرا اور وہ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر بلایا اور فرمایا: بہ تحقیق میری ماں تمہاری ماں کے ساتھ ہے۔ (الرسائل التسع للسیوطی، رسالۂ التعظیم والمنۃ، ص ۶)

نقد و تبصرہ ۔ اس حدیث کے متعلق علامۂ ذھبی نے "مختصر المستدرک" میں اس حدیث کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: لا واللہ! فعثمان بن عُمیر ضعّفہ الدارقطنی "خدا کی قسم یہ حدیث صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کے راویوں میں عثمان بن عُمیر ہیں جن کو دارقطنی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

اس کے بعد علامہ سیوطی لکھتے ہیں: فبیّن الذھبی ضعف الحدیث و حلف علیہ یمینا شرعیاً یعنی ذھبی نے اس حدیث کے ضعف کو اُجاگر کر دیا اور اُس کے ضعیف ہونے پر شرعی قسم کھائی۔

(الرسائل التسع للسیوطی، رسالۂ مسالک الحنفاء، ص ۶۲)

پس یہ حدیث بھی ضعیف ہونے کی وجہ سے حضرت آمنہ کے

مشرکہ اور جہنمی ہونے کے قول کو ثابت نہیں کر سکتی۔

حدیث چہارم۔ حدیث احیائے الوین آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نقد و تبصرہ۔

حدیث احیائے الوین آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہم باب دویم میں جو حضرت عبداللہ کے مذہب کے متعلق ہے، سیر حاصل تبصرہ کر چکے ہیں۔ اُس تمام بحث کے یہاں اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں حدیث احیاء جتنے بھی طریقوں سے وارد ہوئی ہے موضوع ثابت ہوتی ہے۔ قارئین کرام اس بحث کو باب دوئم میں ملاحظہ کر لیں۔

یہ تھا وہ تمام ذخیرۂ احادیث و روایات جس کو حضرت آمنہ کے مشرکہ اور جہنمی ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ قارئین کرام نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس پورے ذخیرہ کی حیثیت تارِ عنکبوت سے زیادہ نہیں اور یہ حضرت آمنہ کے مشرکہ اور جہنمی ثابت کرنے کے لئے لیے قطعی ناکافی ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اچھا آنحضرت ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جد امجد حضرت عبدالمطلب اور آپ کے والدین ماجدین کا موحد اور پیرو دین ابراہیمی ہونا تو ثابت ہو گیا لیکن کیا اس کا بھی کوئی ثبوت ہے کہ آپ کے تمام آباء و اجداد اور اُمہات و جدات حضرت آدمؑ تک سب کے سب موحد تھے اور اُن میں سے کسی کا بھی دامن عمل شرک سے آلودہ نہیں ہوا۔ اس سوال کا جواب ہم انشاء اللہ اگلے باب میں پیش کریں گے۔

باب چہارم

اس امر کے بیان میں کہ پیغمبر اسلام کے تمام آباؤ اجداد و اُمہات و جدّات دینِ حق پر تھے

موضوع زیر بحث پر ہم علامہ جلال الدین سیوطی کے افادات اُن کے رسالہ "الدرج المنیفہ فی الآباء الشریفہ" سے ہدیۂ قارئیں کرتے ہیں۔ اُن کی عربی عبارت کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:۔

"امام فخر الدین رازی کہتے ہیں: بہ تحقیق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباؤ اجداد حضرت آدمؑ تک سب کے سب مسلک توحید پر گامزن رہے۔ اُن میں کوئی بھی مشرک نہیں ہوا۔ اس حقیقت پر کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباء مشرک نہیں تھے حضور صلعم کا یہ قول دلالت کرتا ہے: میں ہمیشہ پاک و پاکیزہ مردوں کے صلبوں سے طیّب و طاہر عورتوں کے رحموں میں منتقل ہوتا رہا۔ پھر

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مشرک نجس ہوتے ہیں۔ ان دونوں کو ملاکر پڑھنے سے لازم آتا ہے کہ آنحضرت صلعم کے اجداد میں سے کوئی بھی مشرک نہیں تھا۔ امام فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ اسی ضمن میں یہ آیۃ بھی ہے "الذی یراک حین تقوم وتقلبک فی السجدین" (خدا کی وہ ذات ہے جو تجھکو اُس وقت دیکھتی ہے جب تو کھڑا ہوتا ہے اور جو سجدہ گزاروں میں تیری لوٹ پلٹ دیکھتی رہی ہے)۔ اس کے یہ معنٰی ہیں کہ انحضرت صلعم کا نور ایک سجدہ گزار سے دوسرے سجدہ گزار کی طرف منتقل ہوتا رہا۔ اس صورت میں یہ آیۂ کریمہ دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام آباءِ کرام مسلمان تھے۔ امام رازی کہتے ہیں: اس صورت میں قطعی طور پر یہ لازم آتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے باپ کافر نہیں تھے بلکہ یہ کافر یعنی آزر انکا چچا تھا۔ یہ امام فخر الدین رازی کے قول کا خلاصہ ہے۔

امام ماوردی نے جو ہم شافعیوں کے امام ہیں اپنی کتاب "الحادی الکبیر" میں دوسری آیت "وتقلبک فی السجدین" سے امام رازی کے مذکورہ صدر نظریہ کی تائید میں دلائل پیش کیئے ہیں اور مجھے اس موضوع پر مجمل اور مفصل بہت سی دلیلیں ملیں، چنانچہ مجمل دلیل دو مقدموں پر مشتمل ہے۔

(۱) مقدمۂ اول یہ ہے کہ احادیث صحیحہ اس چیز پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت آدمؑ سے لیکر جناب عبد اللہ تک پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ

والسلام کے سلسلۂ نسب کی ہر شاخ اپنے اپنے زمانہ کی بہترین شاخ تھی۔

(۲) مقدمہ دوئم یہ ہے کہ احادیث و آثار صحیحہ سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بعثت کے وقت تک روئے زمین ایسے لوگوں سے خالی نہیں رہی جو دین فطرت پر قائم رہے اور اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ اُس کی توحید کے قائل تھے اور اُس کی نماز ادا کرتے تھے۔ اُن ہی کی بدولت زمین محفوظ رہی اور اگر وہ نہ ہوتے تو زمین اور اُس کے رہنے والے سب کے سب ہلاک ہوجاتے۔

مقدمۂ اوّل کے اثبات میں چند دلائل یہ ہیں :۔

(۱) حدیث بخاری: رسول اللہ صلعم نے فرمایا: میں ہر عہد میں اولاد آدم کی بہترین نسل سے اٹھایا جاتا رہا یہاں تک کہ اس عہد میں جس میں موجود ہوں، میں بہترین خاندان سے اٹھایا گیا ہوں۔

(۲) حدیث بیہقی: حضور صلعم نے فرمایا: جب بھی لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہوئے تو اللہ نے مجھے اُن میں سے بہتر گروہ میں رکھا۔ میں اپنے باعفت ماں باپ سے پیدا ہوا اور زمانۂ جاہلیت کی نسبی خرابیوں میں سے کوئی عیب میرے حصّہ میں نہیں آیا۔ میرا نور حضرت آدمؑ کے زمانے سے اب تک باقاعدہ نکاح کے ذریعہ منتقل ہوا۔ زنا وغیرہ کا لگاؤ کبھی بھی نہیں ہوا یہاں تک کہ میں منتقل ہوتا ہوا اپنے ماں باپ تک پہونچا۔

غرض میں اپنی ذات میں تم سب لوگوں سے بہتر ہوں اور میرے آباء تم سب لوگوں کے آباء سے بہتر اور برتر تھے۔

(۳) حدیث ابونعیم وغیرہ: پیغمبر اسلام نے فرمایا: خدا مجھے پاک و پاکیزہ صلبوں سے صاف و ستھرے اور باعفت رحموں کی طرف منتقل کرتا رہا۔ اس طرح کہ میں ہمیشہ ہر عیب سے محفوظ اور ہر خوبی سے آراستہ رہا۔ میرے بزرگوں میں سے جن کی اولاد دو شاخوں میں منقسم ہوتی اُن میں سے جو بہتر شاخ ہوتی اُس میں خدا مجھے رکھتا رہا۔

اسی قسم کی اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں۔

مقدمہ دوئم کی چند دلیلیں یہ ہیں:۔

(۱) عبدالرزاق نے کتاب "مصنّف" میں اور ابن المنذر نے اپنی تفسیر میں ایسی سند کے ساتھ جو امام بخاری اور امام مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح قرار پاتی ہے، حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کی ہے کہ اُنھوں نے فرمایا: روئے زمین پر ہمیشہ ایسے لوگ بھی موجود رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے۔

(۲) امام احمد ابن حنبل نے کتاب "الزھد" میں اور خلال نے کتاب "کرامات الاولیاء" میں ایسی سند کے ساتھ جو امام بخاری اور امام مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح قرار پاتی ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ اُنھوں نے فرمایا: حضرت نوحؑ کے بعد سے زمین کسی وقت بھی ایسے سات افراد سے خالی نہیں رہی جن کی

وجہ سے اللہ تعالیٰ اہل زمین سے عذاب کو ٹالتا رہا۔

اسی قسم کی اور بھی بہت سی روایات ہیں۔

جب ہم ان دونوں مقدموں کو ملا کر دیکھتے ہیں تو قطعی طور پر اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباء کرام میں سے کوئی بھی مشرک نہیں تھا۔ اور وہ اس طرح کہ ان کے بارے میں یہ ثابت ہو چکا کہ اُن میں سے ہر ایک اپنے زمانہ کی بہترین شخصیت تھی پس اگر وہ لوگ جو (حضرات علی اور ابن عباس کے اقوال کے مطابق) دین فطرت پر رہے، آنحضرت صلعم کے آباؤ اجداد تھے تو ہمارا بھی مدعا یہی ہے۔ اور اگر یہ بہترین لوگ ان آباء نبی صلعم کے علاوہ تھے اور شرک پر بھی قائم رہے تو اس سے دو باتوں میں سے ایک بات لازم آتی ہے: یا تو یہ کہ مشرک مسلم سے بہتر ہو اور یہ ہو نہیں سکتا کیونکہ یہ نص قرآن اور اجماع دونوں سے باطل ہے۔ یا پھر یہ کہ آبائے کرام رسول انام سے اور لوگ بہتر ہوں اور یہ صورت احادیث صحیحہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے باطل قرار پاتی ہے۔ پس یہ قطعی طور پر لازم آتا ہے کہ آنحضرت صلعم کے آباء میں سے کوئی شخص بھی مشرک نہ ہو، تاکہ وہ روئے زمین پر اپنے اپنے عہد کی بہترین ہستیاں قرار پائیں۔

مفصل دلیل

دلیل تفصیلی کی یہ صورت ہے کہ بزار نے اپنی مسند میں اور

ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن المنذر نے اپنی اپنی تفسیروں میں اور حاکم نے "مستدرک" میں حق سبحانہ تعالیٰ کے اس قول "کان الناس امۃً واحدۃً" (سب لوگ ایک ہی امت تھے) کی تفسیر میں بہ سند صحیح حضرت ابن عباس سے یہ روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا: حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کے درمیان دس پشتیں گزریں جن میں ہر پشت شریعت حقہ پر قائم تھی۔ اس کے بعد لوگ اختلافات کا شکار ہو گئے، چنانچہ اللہ نے نبیوں کو مبعوث کیا۔

ابن ابی حاتم نے اسی آیت کے ذیل میں قتادہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: ہمیں بتایا گیا ہے کہ آدمؑ اور نوحؑ کے درمیان دس پشتیں گزری ہیں، یہ سب کے سب عالم تھے جن سے لوگ ہدایت پاتے تھے اور شریعت حقہ پر قائم تھے۔ اس کے بعد لوگوں نے اختلاف کیا چنانچہ اللہ نے حضرت نوح کو مبعوث کیا اور وہ پہلے رسول تھے جنھیں اللہ نے اہل زمین کی طرف بھیجا۔

اور قرآن میں حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ میں اُن کا یہ قول بھی ملتا ہے "رب اغفرلی ولوالدیّ ولمن دخل بیتی مومنا" (اے پروردگار! تو میری، میرے ماں باپ کی اور ہر اُس مومن کی جو میرے گھر میں داخل ہو، مغفرت فرما)

پس اس سے اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت نوحؑ تک آنحضرت صلعم کے تمام اجداد مومن تھے، اور حضرت نوحؑ کے

فرزند سام نص قرانی اور اجماع کی رو سے مومن تھے کیونکہ انہوں نے اپنے باپ کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر نجات پائی اور اُس روز سوائے مومن کے کسی نے بھی نجات نہیں پائی تھی۔

اور قرآن شریف میں ہے "وجعلنا ذریتہ هم الباقین" (سورۂ الصافات آیت ،،) یعنی ہم نے اولاد نوح کو ہی باقی رہنے والوں میں رکھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ روایت میں تو یہ بھی وارد ہوا ہے کہ سام نبی تھے اور سام کے فرزند ارفخشد کے بارے میں ابن عبد الحکم نے "تاریخ مصر" میں حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت درج کی ہے کہ وہ مومن تھے۔ پھر اُسی کتاب میں یہ بھی ہے کہ ارفخشد کو اپنے دادا نوح کا زمانہ ملا اور انھوں نے اُس کے حق میں دُعا کی کہ اللہ اُس کی اولاد میں نبوّت اور حکومت قرار دے۔ پھر ابن سعد نے "طبقات" میں کلبی کے طریق سے جو روایت درج کی ہے اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ ارفخشد کے بیٹے شارُخ سے لیکر تارُخ (پدر حضرت ابراہیمؑ) تک سب کے سب دین اسلام پر تھے۔

جہاں تک آزر کا تعلق ہے تو ارجح قول وہی ہے جو امام رازی نے بیان کیا ہے کہ وہ ابراہیمؑ کا چچا تھا نہ کہ باپ، اور امام رازی سے پہلے بھی علمائے سلف کا ایک گروہ اسی طرف گیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ، مجاہد، ابن جریج اور سدی سے اسناد کے ساتھ روایتیں بیان کی گئیں ہیں جن میں اُن کا یہ قول ملتا

ہے: "آزر ابراہیمؑ کا باپ نہیں تھا۔ ابراہیمؑ حقیقت میں تارخ کے بیٹے تھے"۔ تفسیر ابن منذر میں میری نظر سے ایک روایت گزری جس میں اس کی تصریح کی گئی ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا۔

جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اُس سے بخوبی ثابت ہے کہ حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت ابراہیمؑ تک پیغمبر اسلام کے آباؤ اجداد کے ایمان کا نہ صرف ثبوت ملتا ہے بلکہ اُس پر سب کا اتفاق ہے۔ البتہ آزر کے بارے میں اس حیثیت سے اختلاف پایا جاتا ہے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کا باپ تھا یا چچا۔ پس اگر باپ تھا تو وہ حضور صلعم کے سلسلۂ اجداد سے مستثنیٰ قرار پائے گا اور اگر چچا تھا تو اُس سے خارج ہو جائے گا اور آپ کا سلسلۂ نسب صحیح و سالم رہے گا۔

اب جہاں تک حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے بعد کے زمانہ کا تعلق ہے تو احادیث صحیحہ اور اقوال علماء اس پر متفق ہیں کہ جناب ابراہیمؑ کے بعد عمرو بن لحی خزاعی کے زمانہ تک عرب دین ابراہیمی پر قائم رہے۔ اُن میں سے کسی ایک نے بھی کفر اختیار نہیں کیا۔ اور نہ بتوں کی پرستش کی۔ عمرو بن لحی وہ پہلا شخص تھا جس نے جناب ابراہیم علیہ السلام کے دین کو بدل ڈالا، بتوں کی پرستش کی اور سائبہ اونٹنی کو بتوں کے نام پر آزاد چھوڑنے کا طریقہ ایجاد کیا۔

بخاری اور مسلم نے ابو ہریرہؓ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نے عمرو بن لحی خزاعی کو اس

حال میں دیکھا کہ وہ دوزخ میں اپنی آنتوں کو کھینچ رہا تھا۔ اور وہ پہلا شخص تھا جس نے سائبہ اونٹنی کو بتوں کے نام پر آزاد چھوڑنے کا طریقہ رائج کیا۔ اسی طرح ابن جریر نے اپنی تفسیر میں بہ سند ابو ہریرہؓ یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: میں نے عمرو بن لحی بن قمعہ بن خندف کو جہنم میں اپنی آنتوں کو کھینچتے ہوئے دیکھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے حضرت ابراہیمؑ کے دین کو بدل ڈالا۔

اسی طرح امام احمد نے اپنے مسند میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی سند سے یہ حدیث درج کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: سب سے پہلا شخص جس نے سائبہ اونٹوں کو بتوں کے نام پر آزاد چھوڑنے کی بدعت جاری کی اور بتوں کی پرستش شروع کی ابو خزاعہ عمرو بن عامر تھا۔ اور میں نے اُس کو اس حالت میں دیکھا کہ وہ دوزخ میں اپنی آنتوں کو کھینچے پھر رہا ہے۔

علامہ شہرستانی اپنی کتاب "الملل و النحل" میں لکھتے ہیں:
"اہل عرب دین ابراہیمی پر قائم تھے اور عقیدۂ توحید اُن میں جاری وساری تھا۔ سب سے پہلا شخص جس نے اُس دین کو بدل ڈالا اور بتوں کی پرستش شروع کی عمرو ابن لحی تھا۔

اسی طرح حافظ عماد الدین بن کثیر کہتے ہیں: اہل عرب دین ابراہیمی پر گامزن تھے یہاں تک کہ عمرو بن عامر خزاعی مکہ کا حاکم ہوا اور اُس نے بیت اللہ کی تولیت آنحضرت صلعم کے اجداد سے چھین

لی۔ اسی عمرو بن عامر نے بتوں کی پرستش شروع کی اور اہل عرب کے لئے بہت سے گمراہ کن باتیں ایجاد کیں۔ اس نے حج کے موقع پر تلبیہ میں "لا شریک لَہٗ" کے بعد یہ الفاظ بڑھائے "اِلَّا شریکاً ھو لکَ تملکہ وما ملکَ" (یعنی سوائے ایک شریک کے اور کوئی شریک نہیں جو بھی تیرا ہے۔ تجھے اس پر اقتدار حاصل ہے۔ اس کو تجھ پر کوئی قدرت نہیں) چنانچہ یہ پہلا شخص تھا جس نے تلبیہ میں یہ اضافہ کیا اور اہل عرب نے اُس مشرکانہ حرکت میں اُس کی پیروی کی۔ پس اس معاملہ میں وہ قوم نوح کے مشابہ ہو گئے اور وہ اس طرح کہ اپنے اسلاف کے مومن ہونے کے بعد انھوں نے کفر اختیار کر لیا لیکن اس کے باوجود اُن میں ایسے لوگ بھی تھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر قائم رہے۔

چنانچہ ابن حبیب نے اپنی تاریخ میں یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: (آنحضرت صلعم کے اجداد) عدنان، مُعدّ، ربیعہ، مُضر، خزیمہ اور اسَد سب ملّت ابراہیمی کے پیرو تھے۔ پس اُن کو خیر سے یاد کرو۔

ابن سعد نے طبقات الکبریٰ میں عبداللہ ابن خالد کی ایک مُرسَل حدیث درج کی ہے جس میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "مُضر کو برا نہ کہو کیونکہ وہ دین اسلام پر تھا"۔ اسی طرح سہیلی کی کتاب "الروض الانف" میں ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا: "الیاس کو بُرا نہ کہو کیونکہ وہ مومن تھا"۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے

کہ حج کے موقع پر وہ اپنے صُلب سے نبی اکرمؐ کا تلبیہ سُنا کرتا تھا۔ پھر اسی کتاب "الروض الأنف" میں ہے کہ کعب ابن لوی پہلا شخص تھا جس نے جمعہ کے روز لوگوں کو جمع کیا۔ چنانچہ قریش اُس روز اُس کے پاس جمع ہوا کرتے تھے اور وہ اُن کے سامنے خطبہ پڑھا کرتا تھا اور اُن سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مبعوث ہونے کا ذکر کیا کرتا تھا اور اُن کو آگاہ کیا کرتا تھا کہ وہ اُس کی اولاد سے ہوں گے اور اُنہیں اُن پر ایمان لانے اور اُن کے اتباع کرنے کا حکم دیا کرتا تھا اور اس کے متعلق شعر بھی پڑھا کرتا تھا جن میں سے ایک شعر کا ترجمہ یہ ہے :۔

"اے کاش میں اُس وقت اُس کی دعوت دین کا مشاہدہ کرتا جبکہ قریش حق کو چھوڑ کر بغاوت پر اُتر آئیں گے"

سُہیلی کہتے ہیں: ماوردی نے "کتاب الاعلام" میں اس روایت کا ذکر کیا ہے۔ میں کہتا ہوں ابونعیم نے "دلائل النبوۃ" میں بھی اس روایت کی تخریج کی ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے بخوبی ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم سے لیکر کعب بن لوی اور اُس کے فرزند مرّہ تک اجداد آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مومن تھے اور اُن کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ اب مُرّہ اور عبد المطلب کے درمیان پیغمبر اسلام کے چار آباء رہ جاتے ہیں یعنی کلاب، قصّی، عبد مناف اور ہاشم ان کے بارے میں کوئی ایسی

روایت تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوا جن میں ان کے کفر و ایمان کا بالصراحتہ ذکر کیا ہو۔

اب صرف چند دلیلیں باقی رہتی ہیں جن کا تعلق حضرت ابراہیم کی نسل میں اُن لوگوں سے ہے جو آنحضرت صلعم کے سلسلۂ نسب میں آتے ہیں۔

(۱) پہلی دلیل اللہ تعالےٰ کے اس قول پر مشتمل ہے:

واذ قال ابراھیم لابیہ وقومہٖ اِنّنی براءٌ مما تعبدون الا الذی فطرنی فاِنہ سیھدین، وجعلھا کلمۃً باقیۃً فی عقبہ (سورۂ ۴۳ آیت ۲۸۔

یعنی اُس وقت کو یاد کرو جب ابراہیمؑ نے اپنے اب اور اپنی قوم سے کہا کہ جن معبودوں کو تم پوجتے ہو میں اُن سے بے تعلق ہوں۔ میرا تعلق تو صرف اُس معبود سے ہے جس نے مجھے پیدا کیا کیونکہ وہی میری ہدایت کرتا ہے اور اس چیز کو ہم نے ابراہیم کی نسل میں ایک باقی رہنے والا کلمہ قرار دیدیا۔

عبد ابن حمید نے اللہ تعالیٰ کے قول "وجعلھا کلمۃ باقیۃ فی عقبہ" کے ذیل میں حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی ہے:

"اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں کلمۂ لا الہ الا اللہ باقی رکھا" مجاہد سے بھی ایسی ہی روایت نقل کی گئی ہے۔

قتادہ سے بھی مذکورہ بالا آیت کے سلسلہ میں یہ روایت کی گئی

ہے کلمۂ باقیہ سے مراد لا الٰہ الا اللہ، کی شہادت اور توحید کا اعتراف ہے یعنی حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں اُن کے بعد ہمیشہ ایسے لوگ ہوتے رہیں گے جو کلمۂ توحید کے قائل رہیں گے۔

ابن المنذر نے خدا کے قول " وجعلها کلمۃ باقیۃ فی عقبہ" کی تفسیر میں ابن جُریج سے یہ روایت کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد اُن کی ذریت میں ہمیشہ ایسے لوگ ہوتے رہے جو لا الٰہ الا اللہ کہتے رہے عبدالرزاق اور ابن المنذر نے خدا کے مذکورہ صدر قول کے سلسلہ میں قتادہ سے روایت کی ہے کہ "کلمۃ باقیۃ" سے مراد اخلاص اور توحید ہے۔ حضرت ابراہیم کی ذریت میں ہمیشہ ایسے لوگ ہوتے رہے جو اللہ کی توحید کے قائل تھے اور اُسی کی پرستش کرتے تھے۔

(۲) دوسری دلیل اللہ کے اس قول پر مشتمل ہے " رب اجعلنی مقیم الصلوٰۃ ومن ذریتی" (سورۂ ابراہیم آیت ۴۰) یعنی (حضرت ابراہیمؑ نے عرض کیا) اے پروردگار! تو مجھکو اور میری ذریت میں سے لوگوں کو نماز قائم کرنے والا قرار دے۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آیت اس چیز پر دلالت کرتی ہے کہ ذریت ابراہیمؑ میں سے ہمیشہ ایسے لوگ ہوتے رہیں گے جو دین فطرت پر قائم رہیں گے اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے۔ ہم نے جو دلائل احادیث و آثار اوپر بیان کیے ہیں اُن سے یہ روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ امام فخر الدین رازی کا یہ قول کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

کے تمام آباؤ اجداد موحّد تھے بالکل صحیح اور حق ہے۔ حافظ شمس الدین بن ناصر الدین دمشقی نے اس سلسلہ میں کیا خوب شعر کہے ہیں:

تنقل احمد نوراً عظیماً   تلألأ فی جباہ الساجدینا

تقلب فیھم قرناً فقرناً   الی ان جاء خیر المرسلینا

ترجمہ:۔ جناب احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ایک عظیم نور کی شکل میں منتقل ہوتے رہے اور اُن کا نور سجدہ گزاروں کی پیشانیوں میں چمکتا رہا اور ہر عہد میں انہیں سجدہ گزاروں میں یہ نور لوٹتا پلٹتا رہا تا اینکہ وہ آخر میں خیر المرسلین بن کر ظہور پذیر ہوا۔

اب صرف عبد المطلب (اور عبد اللہ) کا معاملہ باقی رہ جاتا ہے"

(الرسائل التسع للسیوطی، رسالہ الدرج المنیفہ، ص ۸۔ ۱۶)

جناب عبد المطلب اور حضرت عبد اللہ کے متعلق ہم باب اوّل و دوئم میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ یہ دونوں بزرگوار مُوحّد اور پیرو دین ابراہیم تھے۔

پس یہ بخوبی ثابت ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے تمام آباؤ اجداد حضرت عبد اللہ سے لیکر حضرت آدم تک سب کے سب مُوحّد اور دین حق پر تھے اور اُن میں سے کسی ایک کا بھی دامن عمل طرفۃ العین کے لئے بھی کفر و شرک کی نجاست سے آلودہ نہیں ہوا۔

آنحضرت صلعم کی اُمّہات و جدات کا مذہب:

کتب سیر و تواریخ کے مطالعہ سے معلوم

ہوتا ہے کہ جن جن بزرگواروں کی پیشانیوں میں نور محمدی جلوہ آرا ہوتا رہا اُن میں سے ہر بزرگ اپنے جانشین کو یہ وصیت کرتا رہا کہ اس نور کی حفاظت کرنا اور اس کو طیب و طاہر خواتین کے رحم کے علاوہ کسی غیر مناسب جگہ پر نہ رکھنا۔ ان تمام روایتوں کو نقل کرنا باعث طوالت ہوگا اس لئے ہم ان تمام روایات کا وہ خلاصہ پیش کردیتے ہیں جو شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب مدارج النبوۃ میں درج کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"چوں آدم وفات یافت شیثؑ را وصیت کرد کہ نہد ایں نور را مگر در زنان طاہرات۔ و شیث نیز وصیت کرد پسر خود را کہ نوش نام داشت بایں، و ہمیشہ جاری بود ایں وصیت، نقل کردہ می شد ایں نور از قرنی بقرنی تا رسانید حق تعالیٰ ایں نور را بہ عبدالمطلب و ولد وی عبداللہؑ و پاک گردانید وی تعالیٰ ایں نسب شریف را"

(مدارج النبوۃ جلد ۲ ص ۶ مطبوعہ مطبع منشی نولکشور کانپور)

جب حضرت آدم نے وفات پائی تو شیث کو یہ وصیت کی کہ وہ اس نور کو صرف پاک و پاکیزہ خواتین کے سپرد کرے۔ شیث نے بھی اپنے فرزند نوش کو یہی وصیت کی۔ اور یہ وصیت ہمیشہ نسلاً بعد نسلاً اسی طرح جاری رہی۔ ہر دور اور ہر عہد میں یہ نور اسی نہج سے منتقل کیا جاتا رہا یہاں تک کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے اس نور کو جناب عبدالمطلب اور اُنکے فرزند عبداللہ تک پہونچا دیا اور اس طرح اس نسب شریف کو پاک و پاکیزہ رکھا۔

مذکورہ بالا اقتباس سے بخوبی ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور ہمیشہ نساء طاہرات میں منتقل ہوتا رہا اور نساء طاہرات موحدہ ہی ہوسکتی ہیں کیونکہ قرآن مجید میں مشرکوں کو تو نجس بتلایا گیا ہے۔ پس اچھی طرح ثابت ہوگیا کہ حضور نبی کریم کی اُمہات وجدات سب کی سب دین حق پر تھیں اور اُن میں سے کوئی بھی مشرکہ یا کافرہ نہیں تھی۔ اس کی تائید آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُس مشہور حدیث سے ہوتی ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے۔ "لَمْ ازل انقلُ من اصلاب الطاہرین الی ارحام الطاہرات"

یعنی میں ہمیشہ پاک وپاکیزہ مردوں کے صُلبوں سے طیب وطاہر عورتوں کے ارحام میں منتقل ہوتا رہا۔

مذکورہ صدر بحث کو پڑھنے کے بعد ایک معترض یہ اعتراض کرسکتا ہے کہ اس میں اور سب باتیں تو قابل قبول ہیں لیکن آزر کے متعلق علامہ سیوطی خود مذبذب نظر آتے ہیں کہ آیا وہ حضرت ابراہیم کا باپ تھا یا چچا کیونکہ وہ لکھتے ہیں کہ "اگر وہ باپ تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلہ اجداد سے مستثنیٰ قرار پائے گا اور اگر چچا تھا تو اُس سے خارج ہوجائے گا اور آپ کا سلسلۂ نسب صحیح وسالم رہے گا"۔ ایسی صورت میں قطعیت کے ساتھ آزر کو چچا کیونکر تسلیم کیا جاسکتا ہے جبکہ قرآن میں

اُس کو صاف طور سے اب کہا گیا ہے! یہ اعتراض مذکورہ بالا اعتراض سے درحقیقت پیدا ہوتا ہے اور ہم انشاء اللہ اگلے باب میں اس اعتراض کا جواب شافی پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

باب پنجم

اس مسئلہ کی تحقیق میں کہ آیا آزر جناب ابراہیمؑ کا باپ تھا

مسئلۂ زیر بحث کہ آیا آزر بت تراش و بت پرست جناب ابراہیم علیہ السلام کا حقیقی باپ تھا، انتہائی اہم مسئلہ ہے کیونکہ اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ واقعی حضرت ابراہیمؑ کا حقیقی باپ تھا تو مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سلسلۂ نسب شائبۂ کفر و شرک سے مبرا و منزہ تھا باطل ہو کر رہ جاتا ہے۔

آئیے اب اس مسئلہ کی تحقیق کریں۔ بدقسمتی سے عہد ابراہیمی کی کوئی تاریخ موجود نہیں جس سے اس حقیقت پر کچھ روشنی پڑ سکے اس موضوع پر۔ جو مواد مہیا ہو سکتا ہے وہ تورات، قرآن اور

احادیث ہیں اور ان ہی مآخذ سے حتی المقدور ہم اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔

یہ تو حقیقت ہے کہ قرآن مجید میں آزر کو جناب ابراہیمؑ کا اب کہا گیا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً اِنِّیْۤ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ (سورۃ انعام آیۃ ۷۵)

(اے رسول اُس وقت کو یاد کرو) جب ابراہیم نے اپنے اب آزر سے کہا: کیا تم بتوں کو خدا مانتے ہو، میں تو تم کو اور تمہاری قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھتا ہوں۔

عرف عام میں لفظ "اب" باپ ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اس لئے آیۂ مذکورالصدر کو پڑھنے کے بعد فوراً جس طرف خیال جاتا ہے وہ یہ ہی ہے کہ آزر جناب ابراہیم علیہ السلام کا باپ تھا لیکن تورات سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ توریت میں حضرت ابراہیمؑ کے حقیقی باپ کا نام "تارح" دیا ہوا ہے۔ چنانچہ توریت، کتاب پیدائش، باب ۱۱، آیت ۲۷ کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اور یہ تارح کا نسب نامہ ہے۔ تارح سے ابرام اور نحور اور حاران پیدا ہوئے اور حاران سے لوط پیدا ہوا"

غالباً اسی لئے علمائے اسلام میں جناب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کے نام کی تعیین میں اختلاف ہے۔ جمہور مورخین، محدثین اور

نسابین کا اس امر پر تو اتفاق ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام تارخ یا تارُخ تھا لیکن اس چیز میں اختلاف ہے کہ آیا تارخ اور آزر ایک ہی شخص کے نام ہیں یا یہ دو شخص ہیں۔ ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ تارُخ اور آزر ایک ہی شخص کے نام ہیں۔ تارخ اصل نام ہے اور آزر اُس کا لقب ہے۔ دوسرا گروہ اس طرف گیا ہے کہ تارخ حضرت ابراہیم کے حقیقی باپ ہیں جو موحد اور مومن تھے اور آزر آپ کا چچا تھا اور یہ مشرک اور بت پرست تھا۔ اس گروہ کا کہنا ہے کہ عرب چچا کے لئے بھی لفظ "اب" کا استعمال کرتے تھے چنانچہ قرآن کی یہ آیت اس پر شاہد ہے:۔

ام کنتم شہداء اذ حضر یعقوب الموتُ لا، اذ قال لبنیہ ما تعبدون من بعدی قالو نعبد الٰھک و الٰہ اٰبائِک ابراھیم و اسمٰعیل و اسحٰق الٰھا واحدا ج ونحن لہ مسلمون ہ	کیا تم موجود تھے جب یعقوب کو موت کا سامنا ہوا اور انھوں نے اُس وقت اپنی اولاد سے کہا کہ تم میرے بعد کس کو معبود سمجھو گے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم خدائے واحد کو جو تمہارا اور تمہارے آباء ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق کا معبود ہے، اپنا معبود سمجھیں گے اور ہم اُسی کے فرمانبردار اور اطاعت شعار رہیں گے۔

(سورۂ بقرہ، آیت ۱۳۴)

ظاہر ہے کہ حضرت اسحقؑ حضرت یعقوب کے حقیقی باپ تھے اور حضرت اسمٰعیلؑ چچا تھے لیکن اس آیت میں چچا کے لئے بھی لفظ "اب" استعمال کیا گیا ہے جس سے ثابت ہو گیا کہ زبان عربی میں چچا کے لئے لفظ "اب" مستعمل ہے اور اس میں کوئی غرابت نہیں ہے۔

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ زبان عربی میں لفظ "اب" کا اطلاق چچا پر بھی ہوتا ہے اب غور طلب چیز یہ ہے کہ آیا حضرت ابراہیمؑ کے چچا تھے بھی یا نہیں۔ توریت کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے چچا تھے۔ چنانچہ توریت کتاب پیدائش، باب ۱۱، آیات ۲۴، ۲۵ کے الفاظ یہ ہیں:-

"نحور انتیس برس کا تھا جب اس سے تارح پیدا ہوا۔ اور تارح کی پیدائش کے بعد نحور ایک سو انیس برس اور جیتا رہا اور اس سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں۔"

آزر کے متعلق دونوں گروہوں کے اقوال معلوم ہو جانے کے بعد اور اس حقیقت کا علم ہو جانے کے بعد کہ حضرت ابراہیمؑ کے کئی چچا بھی تھے، ایک اور حقیقت کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے اور وہ استغفار کا صحیح مفہوم ہے۔ استغفار کے معنی ہیں بخشش طلب کرنا، گناہوں سے معافی مانگنا۔ لیکن یہ معنی مستغفر کی نسبت سے تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ اگر مومن کے لئے استغفار کی جائے تو وہ استغفار اس دعا کے مرادف ہو گی کہ خداوندا! اس کے گناہوں

کو معاف کر دے۔ یہ استغفار مرد مومن کی حیات میں بھی ہو سکتی ہے اور مرنے کے بعد بھی۔ لیکن کافر اور مشرک کے معاملہ میں صورت حال جداگانہ ہے۔ مشرک کے لئے اُس کی عین حیات میں استغفار کی جا سکتی ہے کیونکہ اُس وقت اُس کا مطلب اس دُعا کے مرادف ہو گا کہ پروردگارا تو اس کو اللہ اور رسول پر ایمان لانے کی توفیق عنایت فرما لیکن شرک کی حالت میں مرجانے کے بعد اُس کے لئے استغفار نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ استغفار قابل قبول نہیں۔ چنانچہ قرآن شریف میں نص ہے کہ

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ (سورۃ، آیت ۴۸)

یعنی بہ تحقیق اللہ اس کو معاف نہ کرے گا کہ اُس کا کسی کو شریک بنایا جائے اور اُس کے علاوہ جس گناہ کو بھی جس کے حق میں چاہے گا بخش دے گا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کے نازل ہونے پر اس کی اور وضاحت فرما دی۔ چنانچہ مسند امام احمد ابن حنبل میں حضرت عائشہ رضؓ سے منقول ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا: اللہ کے نزدیک گناہ تین قسم کے ہیں، ایک وہ جس کی وہ پرواہ نہیں کرے گا۔ دوسرا وہ جس سے وہ مطلق درگزر نہیں کرے گا، تیسرا وہ جس کو وہ معاف نہیں کریگا۔ پس وہ گناہ جس کو وہ معاف نہیں کرے گا اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دینا ہے جیسا کہ اُس کا ارشاد ہے" اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِہٖ"، اور وہ گناہ جس کی وہ پرواہ نہیں کرے گا وہ انسان کا

حقوق اللہ کے سلسلہ میں اپنے اوپر ظلم کرنا ہے جیسے کسی دن کا روزہ یا نماز ترک کر دینا۔ اس قسم کے گناہ میں اللہ چاہے تو اس سے درگزر کرے اور چاہے تو اس کو نہ معاف کرے۔ اور وہ گناہ جس کی سزا سے وہ درگزر نہیں کرے گا وہ بندوں کا ایک دوسرے پر ظلم کرنا ہے" (تفسیر ابن کثیر، جلد ۱، ص ۵۰۸)

اتنا ہی نہیں کہ جو شخص حالت شرک میں مرا ہو اس کے لئے استغفار کرنا قابل قبول نہیں بلکہ اس کے لئے استغفار کی ممانعت ہے۔ چنانچہ سورۂ توبہ میں اسی آزر کے سلسلہ میں یہ آیت موجود ہے:-

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝ (سورۂ توبہ آیت ۱۱۴)

ابراہیم کا اپنے اب کے لئے مغفرت طلب کرنا صرف اس وعدہ کی بناء پر تھا جو انھوں نے اس سے کیا تھا لیکن جب ان پر یہ واضح ہو گیا کہ وہ دشمن خدا ہے تو وہ اس سے بے تعلق ہو گئے۔ بلاشبہ ابراہیم بہت بردبار تھے۔

اس آیت میں "جب ان پر یہ واضح ہو گیا کہ وہ دشمن خدا ہے" کی تفسیر میں صاحب تفسیر جلالین لکھتے ہیں "بموتہ علی الکفر" یعنی کفر کی حالت میں مر جانے سے یہ معلوم ہو گیا کہ وہ دشمن خدا ہے۔ بیضاوی

لکھتے ہیں: تبیّن بان مات علی الکفر، یعنی کفر کی موت مرنے سے واضح ہوگیا۔ (تفسیر بیضاوی، جلد ۱، ص ۳۶۲ مع تفسیر جلالین برحاشیہ)

حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:-

کان ابراھیم علیہ السلام یستغفر لابیہ مدۃ حیاتہ، فلمّا مات علی الشرک وتبین ابراھیم ذلک رجع عن الاستغفار لہ وتبرأ منہ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲، ص ۱۵۰)

یعنی ابراہیم اپنے باپ کے لئے اُس کی مدۃ حیاۃ میں استغفار کرتے رہے لیکن جب وہ حالت شرک میں مرگیا اور ابراہیم پر یہ صورت حال ظاہر ہوگئی تو وہ اُس کے لئے استغفار کرنے سے رُک گئے اور اُس سے بے تعلق ہوگئے،

پس یہ اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ جو شخص حالت کفر وشرک پر مرے اُس کے لئے استغفار کرنا نہیں چاہیئے بلکہ اُس شخص سے بالکل بے تعلق ہوجانا چاہیئے۔ انبیاء علیہم السلام کے لئے اس کی پابندی بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے کیونکہ اُن ہی کی وساطت سے یہ تمام احکامات اُمت تک پہونچتے ہیں۔ پس لازمی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آزر کے بحالت شرک مرجانے کے بعد جناب ابراہیم علیہ السلام نے اُن کے حق میں روز حساب مغفرت کی دعا ہرگز نہیں کی ہوگی۔

اب غور طلب چیز یہ ہے کہ آزر کب مرا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کس وقت سے جناب ابراہیم اُس کے لئے استغفار کرنے سے باز رہے اور اُس سے قطعی بے تعلق ہو گئے۔ تفاسیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آزر عم ابراہیمؑ کی وفات اُس وقت ہوئی جب آزر اور اُس کی قوم کے لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ کو ان کے بُت پرستی کے خلاف احتجاج کرنے اور معبد کے بتوں کو توڑ ڈالنے کی پاداش میں آگ میں ڈالا اور حق سُبحانہ وتعالیٰ نے اُس بے پناہ آتش کو اُن کے لئے گلزار بنا دیا۔ اس واقعہ کو قرآن میں سورۂ انبیاء کے اندر تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ علامہ سیوطی اپنے رسالہ مسالک الحنفار میں لکھتے ہیں: ابن المنذر نے اپنی تفسیر میں بہ سند صحیح سلیمان بن صُرد (صحابی) سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا: جب قوم ابراہیم نے یہ ارادہ کر لیا کہ ابراہیم کو آگ میں پھینکدیں تو وہ اس انہماک کے ساتھ آگ روشن کرنے کے لئے ہیزم جمع کرنے لگے کہ کوئی ضعیف بڑھیا تک بھی گھر میں باقی نہ رہی۔ جب اُنھوں نے ابراہیم کو آگ میں پھینکنے کا قصد کیا تو ابراہیمؑ نے کہا، حسبی اللہ ونعم الوکیل یعنی اللہ میرے لئے کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ جب اُنھوں نے ابراہیم کو آگ میں ڈال دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"یا نار کونی بردا و سلاما علی ابراھیم" یعنی اے آگ ابراہیمؑ پر ٹھنڈی ہو جا لیکن اتنی ٹھنڈی کہ ابراہیم کو کوئی

نقصان نہ پہونچے بلکہ وہ صحیح وسالم رہے (چنانچہ آگ ٹھنڈی ہوگئی اور ابراہیم صحیح وسالم رہے)۔ فقال عمر ابراھیم: من اجلی دُفع عنہ، فارسل اللّٰہ علیہ شرارۃ من النار فوقعت علیٰ قدمہ فاحرقتہ۔ یعنی یہ دیکھ کر حضرت ابراہیم کے چچا نے کہا کہ میری بدولت اس سے یہ مصیبت ٹل گئی ہے۔ پس اللہ نے اس پر ایک آگ کا انگارہ ڈالا جو اس کے پیر پر پڑا اور اس نے اس کو جلا کر ہلاک کر ڈالا"

(الرسائل التسع للسیوطی، رسالۂ مسالک الحنفاء، ص ۲۹) اس کے بعد علامہ سیوطی لکھتے ہیں۔

فقد صاح فی ھذا الاثر عم ابراھیم وفیہ فائدۃ اخریٰ وھو انہ ھلک فی ایام القاء ابراھیم فی النار۔	یعنی اس روایت میں ابراہیم کے چچا کی صراحت موجود ہے نیز اس میں اور بھی فائدہ ہے اور وہ یہ کہ وہ ابراہیم کے آگ میں ڈالے جانے کے زمانے میں ہلاک ہوا۔

حافظ ابن کثیر نے آیۂ کریمہ "یا نار کونی برداً وسلاماً" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ شعیب الجبائی کا قول ہے کہ جب ابراہیم کو آگ میں پھینکا گیا، کان عمرہ اذ ذاک ست عشرۃ سنۃ، اس وقت ان کی عمر سولہ سال تھی (تفسیر ابن کثیر، جلد ۳، ص ۱۸۴)۔ امام بیضاوی اسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: وکان اذ ذاک ابن ست عشرۃ سنۃ یعنی آگ میں پھینکے جانے کے وقت ابراہیم سولہ سال کے تھے۔ (تفسیر بیضاوی، جلد ۲، ص ۶۱)۔

علامہ طبرسی لکھتے ہیں: وقیل انّ ابراھیم علیہ السلام اُلقِیَ فی النار وھو ابن ست عشرۃ سنۃ "یعنی جب ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو وہ سولہ برس کے تھے (تفسیر مجمع البیان، جلد ۴، ص ۵۴)

پس یہ چیز اچھی طرح ثابت ہوگئی کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو اُن کی عمر ۱۶ سال کی تھی اور اسی عمر میں اسی موقع پر اُن کا چچا آزر بت پرست ہلاک ہوا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ایک سو پچھتر سال ہوئی۔ چنانچہ توریت میں ہے:۔

"اور ابرہام کی کل عمر جب تک کہ وہ جیتا رہا ایک سو پچھتر برس کی ہوئی" (توریت، پیدائش، باب ۲۵، آیت ۷)۔

یہاں سے ثابت ہوا کہ آزر کے بحالت شرک ہلاک ہونے کے بعد حضرت ابراہیم ایک سو انسٹھ برس زندہ رہے اور اس مدت میں اُنہوں نے آزر کے لئے استغفار نہیں کیا۔

علامہ عطاء اللہ ابن فضل اللہ المقلب بہ جمال الحسینی اپنی مشہور کتاب "روضۃ الاحباب" میں لکھتے ہیں کہ آگ میں ڈالے جانے کے واقعہ کے بعد سب سے پہلے جو حضرت ابراہیم پر ایمان لائیں وہ آپ کی چچا زاد بہن سارہ تھیں۔ اس کے بعد اُن کے بھتیجے لوط ایمان لائے۔ کچھ مدت بعد جناب ابراہیم نے حضرت سارہ سے شادی کر لی۔ جناب ابراہیم

برابر دین حق کی تبلیغ کرتے رہے۔ جب اُن کی قوم نے دیکھا کہ لوگ دین ابراہیمی قبول کر رہے ہیں تو انھوں نے جناب ابراہیمؑ کو قتل کرنے کی سازش کی حضرت لوطؑ کو اس کا علم ہو گیا، انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کو اس سازش کی خبر دی۔ جناب ابراہیمؑ اپنی زوجہ سارہ اور اپنے بھتیجے لوط کو ساتھ لیکر ملک کنعان کی طرف ہجرت کر گئے۔

(روضۃ الاحباب، جلد ۱، ص ۲۸، مطبوعہ انوار محمدی پریس لکھنؤ)

مُلا معین کاشفی لکھتے ہیں کہ اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ کی عمر اڑتیس برس کی تھی (معارج النبوۃ، رُکن اوّل، ص ۳۳۴)۔

اسی واقعۂ ہجرت کی طرف قرآن مجید کی یہ آیت اشارہ کرتی ہے۔

"وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ ۝" (سورۂ انبیاء، آیت ۷۱)

یعنی ہم نے ابراہیم اور لوط کو ان کے سرکشوں سے صحیح و سالم نکال کر اُس سرزمین (بیت المقدس) میں پہونچا دیا جس میں ہم نے سارے جہان کے لئے برکت عطا کی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت کی تفصیلات از روئے توریت اور زمانۂ ہجرت کے اہم واقعات

(۱) توریت میں ہجرت کی ابتدا اس آیت سے ہوتی ہے:۔

"اور تارح نے اپنے بیٹے ابرام کو اور اپنے پوتے لوط کو جو حاران کا بیٹا تھا اور اپنی بہو ساری کو جو اُس کے بیٹے ابرام کی بیوی تھی، ساتھ لیا اور وہ سب کسدیوں کے اُوُر سے روانہ ہوئے کہ کنعان کے ملک میں جائیں اور وہ حاران تک آئے اور وہیں رہنے لگے" (توریت، پیدائش، باب ۱۱، آیت ۳۱)

توریت کی یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ تارح پدر ابراہیمؑ مومن تھے جو قوم کے سرکش بُت پرستوں سے اپنے بیٹے ابراہیمؑ کو نکال کر ہجرت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اگر آزر عمِّ ابراہیم کی طرح وہ بھی بُت پرست ہوتے تو وہ بھی اُنہیں کم و بیش ایسے ہی الفاظ میں سرزنش کرتے کہ اے ابراہیم! تو اپنی حرکت سے باز آجا ورنہ میں تجھکو سنگسار کر دوں گا۔

(۲) پھر بحکم خدا جب حضرت ابراہیمؑ کی عمر پچھتر سال کی تھی تو اُنھوں نے حاران سے کنعان کی طرف ہجرت کی اور حوالی بیت المقدس میں آباد ہو گئے۔ توریت کی مندرجہ ذیل آیات اس حقیقت پر شاہد ہیں:۔

"اور خداوند نے ابرام سے کہا کہ تو اپنے وطن اور اپنے ناتے داروں کے بیچ سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکل کر اُس ملک میں جا جو میں تجھے دونگا"

(توریت، پیدائش، باب ۱۲، آیت ۱)۔

"سو ابرام خداوند کے کہنے کے مطابق چل پڑا اور لوط اُس کے ساتھ گیا اور ابرام پچھتّر برس کا تھا جب وہ حاران سے روانہ ہوا" (ایضاً، آیت ۴)

"اور وہاں سے کوچ کرکے (ابرام) اُس پہاڑ کی طرف گیا جو بَیت ایل کے مشرق میں ہے اور اپنا ڈیرا ایسے لگایا کہ بیت ایل مغرب میں اور عی مشرق میں پڑا اور وہاں اُس نے خداوند کے لئے ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند سے دُعا کی" (ایضاً، آیت ۸)

(۳) پھر ملک کنعان میں قحط پڑا اور جناب ابراہیم مع لوط و سارہ سرزمین مصر کی طرف گئے۔ وہاں کے بادشاہ نے آپ کی زوجہ حضرت سارہ کو چھیننا چاہا مگر خدا کے فضل سے وہ اپنے ناپاک ارادوں میں ناکام رہا اور اُس نے حضرت ابراہیم کو بہت کچھ مال و متاع، مویشی اور غلہ دیکر بعزت رخصت کیا۔

(توریت، کتاب پیدائش، باب ۱۲، آیات ۱۰ الغایت ۲۰)

(۴) مصر سے روانہ ہوکر جناب ابراہیم پھر کنعان میں مقام بیت ایل آئے اور پھر یہیں رہنے لگے۔ اس پر توریت کی یہ آیات شاہد ہیں:۔

"اور ابراہیم مصر سے اپنی بیوی اور اپنے سب مال اور لُوط کو ساتھ لیکر کنعان کے جنوب کی طرف چلا"

"اور ابرام کے پاس چوپائے اور سونا چاندی بکثرت تھا"

" اور وہ کنعان کے جنوب سے سفر کرتا ہوا بیت ایل میں اُس جگہ پہونچا جہاں بیت ایل اور عی کے درمیان اُس کا ڈیرا تھا" (توریت، پیدائش، باب ۱۳، آیات ۱-۳)

(۵) جب حضرت ابراہیمؑ کی عمر چھیاسی برس کی ہوئی تو حضرت ہاجرہ کے لطن سے اُن کے ایک لڑکا ہوا جس کا نام اسمٰعیل رکھا گیا۔ توریت میں ہے:-

" اور جب ابرام سے ہاجرہ کے اسمٰعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا" (توریت، کتاب پیدائش، باب ۱۶، آیت ۱۶)

(۶) پھر جب حضرت ابراہیم کا سن سو سال کا ہوا تو اُن کے سارہ کے لطن سے اسحٰق پیدا ہوئے، توریت میں ہے:-

" اور جب اُس کا بیٹا اضحاق اُس سے پیدا ہوا تو ابرہام سو برس کا تھا" (توریت، کتاب پیدائش، باب ۲۱، آیت ۵)

مذکورہ بالا بیان سے یہ حقیقت اچھی طرح نکھر کر سامنے آگئی کہ جناب ابراہیم علیہ السلام کے چھیاسی سال کی عمر میں حضرت اسمٰعیل اور سو سال کی عمر میں حضرت اسحٰق پیدا ہوئے۔ اب ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ سورۂ ابراہیم کی مندرجہ ذیل آیات قابل غور ہیں:-

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ ط	اُس خدا کا شکر ہے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل و اسحٰق دو فرزند عطا کیے۔

اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَاءِ ۝ رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ۝ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝ (سورۂ ابراہیم، آیات ۳۹ تا ۴۱)	اس میں شک نہیں کہ میرا پروردگار دُعا کا سُننے والا ہے۔ اے میرے پالنے والے مجھے اور میری اولاد کو نماز کا پابند بنائے رکھیو۔ پالنے والے میری یہ دُعا قبول فرمالے۔ اے ہمارے پروردگار! قیامت میں تو مجھکو، میرے ماں اور باپ کو اور تمام مومنین کو مغفرت نصیب فرمانا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعاء "اے ہمارے پروردگار! قیامت کے دن تو مجھ کو، میرے ماں اور باپ کو اور تمام مومنین کو مغفرت نصیب فرمانا" کو جب آیات ماسبق کے سیاق اور جو کچھ ہم اوپر پیش کر چکے ہیں اُس کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو اس سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

(۱) اوّل یہ کہ جناب ابراہیمؑ نے یہ دُعا اپنے، اپنے والدین اور مومنین کی مغفرت کے لئے اُس وقت فرمائی جب آپ کی عمر سَو سال سے تجاوز کر چکی تھی کیونکہ جیسا کہ ہم بحوالۂ توریت اوپر عرض کر چکے ہیں، حضرت اسحٰق کی ولادت اُس وقت ہوئی تھی جب آپ کی عمر ۱۰۰ سال کی تھی۔

(۲) یہ دُعا بروز قیامت مغفرت کے لئے آزر کے واسطے نہیں ہو سکتی کیونکہ آزر بحالت کفر و شرک اُس وقت ہلاک ہو چکا تھا جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا تھا اور اُس وقت اُن کی عمر سولہ سال تھی۔

(۳) یقیناً جناب ابراہیمؑ کی یہ دُعا اُن کے حقیقی باپ تارخ یا تارخ کے لئے ہے جن کو جناب ابراہیم ایمان کے اعتبار سے مومنین کی صف میں جگہ دے رہے ہیں اور جن کے ایمان کے متعلق ہم اوپر یہ بھی عرض کر چکے ہیں کہ بعدِ واقعۂ القاء فی النار، وہ حضرت ابراہیم، لوط اور سارہ کو قوم کے مظالم سے بچا کر حاران لے گئے اور پھر وہیں مقیم ہو گئے تھے۔

پس یہ اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ آزر جناب ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا، آپ کا والد نہیں تھا۔ آپ کے والد تارخ تھے اور تارخ اور اُن کی زوجہ دونوں موحّد اور مومن تھے۔ شرک اور بت پرستی سے اُن کا چشم زدن کے لئے بھی واسطہ نہیں رہا۔

قرآن حقیقت میں معجزہ ہے۔ جس مسئلہ شرعیہ میں بھی مسلمان اختلاف کرتے ہیں، اگر فرقہ وارانہ عصبیت سے دور رہتے ہوئے وہ قرآن سے ہی اُس کا حل تلاش کریں تو قرآن اُس کا حل پیش کر دیتا ہے۔ اسی مسئلۂ ایمانِ پدرِ ابراہیم کو لے لیجئے۔ قرآن میں آزر کو اب ابراہیمؑ کہا گیا ہے۔ چونکہ لفظ "اب" مشترک المعانی ہے۔ باپ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور چچا کے لئے بھی، اس لئے جن علماء

نے ظاہر پر حکم لگایا اُنھوں نے آزر کو حضرت ابراہیم کا باپ قرار دیا۔ جن لوگوں کی نظر میں آنحضرت صلعم کی یہ حدیث تھی کہ اللہ ہمیشہ مجھے پاک و پاکیزہ مردوں کے صُلبوں سے طیب و طاہر رحموں میں منتقل کرتا رہا، انھوں نے آزر بُت پرست کو آپ کا چچا قرار دیا اور تارخ کو آپ کا حقیقی باپ تسلیم کیا۔ اس طرح مسلمانوں میں حضرت ابراہیم کے حقیقی باپ کے متعلق اختلاف پیدا ہو گیا۔ قرآن نے حضرت ابراہیم کی اس دُعا میں کہ پروردگارا! تو قیامت کے دن میری، میرے ماں باپ کی اور تمام مومنین کی مغفرت فرما دینا، "اب" کی بجائے لفظ والد استعمال کر کے یہ قطعی طور پر فیصلہ کر دیا کہ والد ابراہیم موحد اور مومن تھے۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی لفظ والد یا والدین استعمال ہوا ہے حقیقی باپ یا حقیقی ماں باپ کے لئے ہی استعمال ہوا ہے۔

اب جو کچھ ہم نے اوپر عرض کیا ہے اُس کی تائید میں ہم علامہ جلال الدین سیوطی کے افادات اُن کے رسالہ "مسالک الحنفاء" سے ہدیۂ قارئین کرتے ہیں۔ اُن کی عبارت کا اُردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ جد پر بھی "اب" کا اطلاق ہوتا ہے اور اس کی تائید میں وہ یہ آیت پڑھا کرتے تھے: فرزندان یعقوب نے کہا کہ ہم تمہارے اور تمہارے آباء کے معبود کی عبادت کریں گے"

اور اسی ابن ابی حاتم نے ابو العالیہ سے اللہ کے اس قول کی تفسیر میں کہ فرزندان یعقوب نے اپنے باپ کے سوال پر جواب دیا کہ ہم تمہارے اور تمہارے آبار ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے معبود کی عبادت کریں گے، لکھا ہے کہ اس میں اسمٰعیلؑ کو جو چچا تھے 'اب' کہا گیا ہے۔

اور یہی حقیقت اُس روایت سے مترشح ہوتی ہے جو ابن المنذر نے اپنی تفسیر میں سند صحیح کے ساتھ صحابی رسولؐ حضرت سلیمان ابن صُرد خزاعی سے نقل کی ہے کہ اُنھوں نے بیان کیا: جب (قوم ابراہیم نے یہ تہیہ کر لیا کہ ابراہیم کو آگ میں ڈالا جائے تو وہ ایندھن جمع کرنے لگے یہاں تک کہ نہایت ضعیف العمر عورتیں بھی اس کام میں لگ گئیں۔ جب اُنھوں نے ابراہیم کو آگ میں پھینکنا چاہا تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔ حَسْبِیَ اللہ نعم الوکیل، اور جب اُنھوں نے پھینکدیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اے آگ! ابراہیم پر سرد ہو جا لیکن اتنی سرد کہ وہ صحیح و سالم رہے" یہ دیکھ کر ابراہیمؑ کے چچا نے کہا کہ میری وجہ سے اُس پر سے یہ مصیبت ٹلی ہے۔ اس پر اللہ نے عم ابراہیمؑ پر ایک آگ کا انگارہ بھیجا جو اُس کے پیر پر پڑا اور جس نے اُس کو جلا کر ہلاک کر ڈالا۔

اس روایت سے واضح ہے کہ جو جل کر ہلاک ہوا وہ حضرت ابراہیمؑ کا چچا تھا۔ نیز اس سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ عم ابراہیم اُس وقت ہلاک ہوا جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تو قرآن میں صاف خبر دی ہے کہ ابراہیمؑ نے اُس

کے لئے استغفار کرنا ترک کر دیا تھا جبکہ اُن پر یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے۔ اور احادیث سے یہ ثابت ہے کہ یہ عداوت حضرت ابراہیم پر اُس وقت ظاہر ہوئی کہ جب وہ حالت شرک میں مرگیا اور اس کے بعد انہوں نے پھر کبھی اُس کے لئے طلب مغفرت نہیں کی۔

چنانچہ ابن ابی حاتم نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا حضرت ابراہیمؑ اپنے اب (آزر) کے لئے برابر استغفار کرتے رہے یہاں تک کہ وہ (بحالت شرک) مرگیا۔ جب اُس کے متعلق اُس کے کافر مر جانے پر انھیں علم ہو گیا کہ وہ دشمن خدا ہے تو پھر انہوں نے اُس کے لئے استغفار نہیں کی۔

ابن ابی حاتم نے محمد بن کعب، قتادہ، مجاہد اور حسن وغیرہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا: ابراہیم اپنے چچا کی زندگی میں اس کے ایمان لانے کی اُمید کرتے تھے لیکن جب وہ حالت شرک میں مرگیا تو وہ اُن سے بے تعلق ہو گئے۔ آگ میں ڈالے جانے کے واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ابراہیم شام کی طرف ہجرت کر گئے۔ پھر اس ہجرت کے ایک مدت بعد وہ مصر میں گئے اور وہاں حضرت سارہ کی وجہ سے جو حادثہ اُن پر پڑنا تھا وہ پڑا۔ اس کے بعد وہ پھر ملک شام کو واپس لوٹے۔ پھر اللہ نے اُنہیں حکم دیا کہ ہاجرہ اور اُس کے فرزند اسمٰعیل کو مکہ میں منتقل کر دے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم نے تعمیل حکم کی اور اُنہیں مکہ پہونچا کر یہ دُعا کی: رَبَّنَا اِنِّی اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِی بِوَادٍ

غیر ذی زرع" الیٰ قولہٗ "ربّنا اغفر لی ولوالدیّ وللمومنین یوم یقوم الحساب" یعنی اے پروردگار! مجھکو میرے والدین کو اور جملہ مومنین کو بروز حساب مغفرت نصیب کرنا۔ اس دعا میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والدین کے لئے دعا کی ہے اور یہ دعا اُن کے چچا کے ہلاک ہوجانے کے ایک مدت مدید بعد کی گئی ہے۔ اس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن میں جس اب ابراہیم کے کفر اور اس کے بارے میں ترک استغفار کا ذکر ہے وہ اُن کا چچا تھا حقیقی باپ نہیں تھا۔ پس خدا کا شکر ہے جس نے مجھے یہ حقیقت الہام کی۔"

(الرسائل التسع، رسالہ مسالک الحنفاء ص ۲۹-۳۰)

بہر کیف اوپر جو کچھ بیان کیا اُس سے دو چیزیں روز روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہیں:-

(۱) اوّل یہ کہ آزر بت پرست حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا۔ آپ کا حقیقی باپ نہیں تھا۔ آپ کے حقیقی والد تارخ تھے جو موحّد اور مومن تھے۔

(۲) دوئم یہ کہ آزر کے قطعی طور پر جناب ابراہیمؑ کے چچا ثابت ہوجانے پر آنحضرت ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے سلسلۂ آباؤ اجداد میں قطعاً شائبۂ کفر و شرک نہیں پایا جاتا۔

مناسب ہوگا اگر اس سلسلہ میں ایک اور اشکال پر بھی غور و خوض کرلیا جائے۔ عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ ابتدار

سے تولیت خانہ کعبہ جناب سرور کائنات علیہ افضل الصلوٰت والکمل التحیات کے آبائو اجداد کے پاس رہی۔ اگر یہ صحیح ہے تو ایک معترض یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ کیا یہ توحید پرستی کے منافی نہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے خانہ کعبہ میں بت نصب کر دیئے گئے اور وہ دیکھتے رہے؟ اس اعتراض کا جواب ہم انشاء اللہ اگلے باب میں ہدیۂ قارئین کریں گے۔

باب ششم

اس سوال کے جواب میں کہ جب بقول مشہور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آباؤ اجداد ہمیشہ خانہ کعبہ کے متولّی رہے تو انہوں نے مُوحِّد ہوتے ہوئے اُس میں بتوں کو کیوں نصب ہونے دیا

اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں خانہ کعبہ کی تعمیر اور اُس کی تولیت کی تاریخ کا ابتداء سے جائزہ لینا پڑے گا۔

عام طور سے جو چیز مشہور ہے وہ یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے مُوسّس یعنی بانیٔ اوّل حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہیں لیکن یہ نظریہ قرآنی اشارات کے خلاف ہے اور اس لئے صحیح نہیں۔ قرآن مجید میں ایسی آیات موجود ہیں جو اس بات کی طرف دلالت کرتی ہیں کہ حضرت ابراہیم سے پہلے

بھی اس مقام پر بیت اللہ تھا جس کی بنیادیں حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں موجود تھیں اور انہوں نے ان ہی بنیادوں پر خانہ کعبہ کی تعمیر کی۔ ان سب میں واضح ترین آیات یہ آیت ہے۔

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ o (سورۂ بقرہ آیۃ ۱۲۷)

یعنی (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم و اسمٰعیل خانہ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے اور (کہتے جاتے تھے) پروردگارا! ہماری یہ خدمت قبول کر لے۔ بے شک تو سمیع و علیم ہے۔

حافظ عمادالدین ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے:۔

"جس سیاق میں یہ آیت وارد ہوئی ہے وہ اس طرف صاف دلالت کر رہا ہے کہ بیت اللہ کی بنیادیں حضرت ابراہیمؑ سے پہلے کی بنی ہوئی موجود تھیں اور حضرت ابراہیمؑ کو محض اُن کی طرف رہنمائی کی گئی"۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد ۱، ص ۱۷۹)

خانہ کعبہ کے بانیٔ اوّل کون تھے

اب دیکھنا یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے بانیٔ اوّل کون تھے۔ علمائے اسلام بانیٔ اوّل کے نامزد کرنے میں مختلف الرائے ہیں۔ ان تمام

مختلف اقوال کا خلاصہ تفسیر ابن کثیر میں مل جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں تین قول ملتے ہیں جو یہ ہیں:۔

(۱) پہلا قول یہ ہے کہ حضرت آدمؑ سے قبل شروع میں خانۂ کعبہ کو فرشتوں نے بنایا۔ یہ قول امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں حضرت ابو جعفر محمد باقر ابن علی ابن الحسین علیہم السلام سے نقل کیا ہے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ ابتداء میں خانۂ کعبہ کو حضرت آدمؑ نے بنایا اور اُس میں پانچ پہاڑوں یعنی حِرا، طورِ سینا، طورِ زیتا، جبل لُبنان، اور جُودی کے پتھر استعمال کئے۔ اس قول کو عبد الرزاق نے بواسطہ ابن جُریج، اور اُس نے بواسطۂ عطا اور سعید ابن المسیب نقل کیا ہے۔

(۳) تیسرا قول یہ ہے کہ خانۂ کعبہ کے معمارِ اوّل حضرت آدم کے فرزند حضرت شیث علیہ السلام ہیں۔ یہ قول حضرت ابن عباس کعب الاحبار، قتادہ اور وھب بن منبّہ سے مروی ہے۔

ہمیں اس چیز کی تحقیق کرنا مقصود نہیں کہ ان تینوں اقوال میں کونسا قول ارجح ہے کیونکہ یہ بحث ہمارے موضوعِ زیرِ بحث سے خارج ہو گی خانۂ کعبہ کے مؤسّسِ اوّل خواہ ملائکہ ہوں، خواہ حضرت آدمؑ اور خواہ حضرت شیث علیہ السلام، بہر کیف ان اقوال سے اتنا ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت آدم یا حضرت شیثؑ کے زمانہ سے بیت اللہ کا وجود تھا۔

خانۂ کعبہ کی اس عمارت اوّل کے متعلق تاریخ کا یہ بیان ہے:
ثُمَّ لَمَّا جَاءَ الطُّوفَانُ انْهَدَمَ وَبَقِيَ مَحَلُّهُ، یعنی جب طوفان نوح آیا تو خانۂ کعبہ منہدم ہو گیا اور جس جگہ پر وہ بنا ہوا تھا وہ باقی رہ گئی۔ (سیرۃ حلبیہ، جلد ۱، ص ۱۴۸)۔

تولیت خانۂ کعبہ از آدم تا نوح علیہ السّلام

عہدنامۂ قدیم، کتاب پیدائش، باب پنجم میں حضرت آدمؑ سے حضرت نوح تک دس پشتیں بیان کی گئی ہیں۔ سیرۃ ابن ہشام میں بھی دس ہی پشتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ سب حضور صلعم کے اجداد تھے۔ ان کے نام یہ ہیں: نوح ابن لمک بن متوشلخ ابن اخنوخ ابن یرد، ابن مہلائیل بن قاینی بن انوش، بن شیث بن آدمؑ۔ (سیرۃ ابن ہشام اردو ترجمہ، جلد ۱، ص ۱) یہ سب خانۂ کعبہ کے متولی اور دین اسلام کے ماننے والے تھے۔ چنانچہ علامہ سیوطی اپنے رسالے مسالک الحنفاء میں بحوالہ طبقات ابن سعد بسند حضرت ابن عباسؓ لکھتے ہیں:
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں حضرت آدم سے نوح تک دس پشتیں گزریں۔ یہ سب بزرگ اسلام پر فائز تھے۔
(الرسائل التسع للسیوطی، رسالہ مسالک الحنفاء، ص ۲۶)
ممکن ہے اس منزل پر کسی کو یہ اشکال ہو کہ قرآن میں سورۂ نوح کے اندر قوم نوح کے بتوں وُدّ، سُواع، یغوث، یعوق، نسر وغیرہ کا ذکر

موجود ہے جن کی وہ پرستش کیا کرتے تھے۔ کیا یہ بُت خانۂ کعبہ کے علاوہ کسی اور مقام پر نصب تھے؟

یہ اشکال اس مفروضہ کے تحت وارد ہو سکتا ہے کہ قوم نوح کا مسکن ملک عرب تھا۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ قوم نوح کا مسکن عراق تھا۔ اس قول کی تائید حسب ذیل واقعات سے ہوتی ہے:۔

(۱) عہد نامۂ قدیم الکتاب پیدائش، باب ۱۱ آیات الغایت ۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفان نوح کے بعد حضرت نوح کی اولاد اور جو لوگ اُن کے ساتھ کشتی میں سوار تھے، ملک بابل میں آباد ہو گئے جہاں اُن کے آباؤ اجداد آباد تھے۔ بابل مسلمہ طور سے عراق کا علاقہ ہے۔

(۲) پھر سورۂ ھود میں ہے کہ سفینۂ نوح آخر الامر کوہ جودی پر آکر رکا۔ معجم البلدان یاقوت حموی میں ہے کہ جودی عراق کے صوبۂ موصل میں دریائے دجلہ کے مشرق میں پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے۔

ان شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قوم کی طرف حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے تھے وہ عراق کی سرزمین میں آباد تھی۔ قوم نوح کے بُت کہاں نصب تھے اس کا حال صحیح بخاری میں ملتا ہے۔ امام بخاری سورۂ نوح کی آیت لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا (آیت ۲۳) کی تفسیر میں حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں "یہ سب نام قوم نوح کے صالح لوگوں کے تھے، جب وہ مر گئے تو شیطان نے اُن کی قوموں کے

دلوں میں یہ بات ڈالی کہ جس مکان میں یہ لوگ رہا کرتے تھے اور اکثر بیٹھا کرتے تھے وہاں ایک ایک بُت رکھ دو اور اُن پر اُن کا نام لگا دو انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر لوگوں نے ان کی عبادت شروع کر دی ہے۔

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ قوم نوح کے بُت اُسی سرزمین میں نصب تھے جہاں وہ آباد تھی۔ خانۂ کعبہ میں ان بتوں کے نصب ہونے کا ذکر کسی تاریخ میں مذکور نہیں۔

حضرت نوحؑ کے بعد سے آغاز عہد حضرت ابراہیمؑ تک خانۂ کعبہ کی تولیّت

ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ طوفانِ نوح میں خانۂ کعبہ منہدم ہو گیا تھا اور جس جگہ وہ واقع تھا وہ مقام باقی رہ گیا تھا۔ اس وقت سے لیکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد رسالت کے آغاز تک کسی نے اس کو از سر نو تعمیر نہیں کیا۔ صاحب سیرۃ الحلبیہ کی اصل عبارت یہ ہے:

"لما جاء الطوفان انہدم وبقی محلہ، وقیل انہ استہدم ولم یبنہ احد الی زمن ابراھیم علیہ الصلوٰۃ والسلام"

یعنی، جب طوفان نوح آیا تو خانۂ کعبہ منہدم ہو گیا اور جس جگہ وہ بنا ہوا تھا وہ باقی رہ گئی ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اسی شکستہ حالت میں رہا اور حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک کسی نے اس کی

از سر نو تعمیر نہیں کی (سیرۃ الحلبیہ، جلد ۱، ص ۱۴۸)

ظاہر ہے کہ جب اس طویل عرصہ میں خانۂ کعبہ کا وجود ہی نہ رہا تو اس زمانہ میں اُس میں بتوں کے نصب ہونے یا اُس کی تولیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

جناب ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کا کعبہ کو از سر نو تعمیر کرنا اور اُس کا متولّی ہونا

طوفان نوح میں خانۂ کعبہ منہدم ہو گیا تھا۔ امتداد زمانہ کی وجہ سے اُس کے آثار بالکل مٹ گئے تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں صرف اس قدر علم تھا کہ کعبہ سرزمین مکہ میں تھا لیکن کس مقام پر واقع تھا اس کی کسی کو خبر نہ تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی زوجہ ہاجرہ اور اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کو سرزمین مکہ میں آباد کر دیا تھا جو اُس زمانہ میں ایک بے آب و گیاہ میدان تھا۔ یہاں چاہ زمزم برآمد ہوا اور اُس کی وجہ سے قبیلۂ جرہم بھی وہیں آباد ہو گیا حضرت اسمٰعیلؑ نے ان ہی لوگوں کے درمیان پرورش پائی۔ جب وہ جوان ہو گئے تو قبیلۂ جرہم کی ایک خاتون سے اُنھوں نے شادی کر لی۔ حضرت ابراہیمؑ گاہے گاہے اپنی زوجہ اور اپنے فرزند کو سنبھالنے کے لئے ملک شام (فلسطین) سے مکہ کی

طرف آتے رہتے تھے۔ ان تمام واقعات کی تفصیل صحیح بخاری کتاب الانبیاء میں اُس حدیث کے اندر موجود ہے جو حضرت ابن عباس سے منقول ہے۔

بہرکیف جب حضرت اسمٰعیل جوان ہو گئے تو حضرت ابراہیمؑ کو بارگاہ ایزدی سے پرانی بنیادوں پر خانہ کعبہ کی تعمیر کا حکم دیا گیا لیکن وقت یہ تھی کہ پرانی بنیادوں کا کیونکر پتہ چلے کہ جن پر ان سے پہلے خانہ کعبہ بنا ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں خداوند عالم نے مدد فرمائی اور اُس موضع و محل کو جہاں پہلے کعبہ بنا ہوا تھا حضرت ابراہیمؑ پر ظاہر کر دیا۔ آیہ وافی ہدایہ وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ (سورۂ حج آیت ۲۶) یعنی جب ہم نے ابراہیم کے لئے محل بیت اللہ معین کر دیا۔ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

مفسرین نے اس آیت کے تحت تین قول نقل کئے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) اوّل یہ کہ جب حضرت ابراہیم کو محل خانۂ کعبہ کے معلوم کرنے میں پریشانی ہوئی تو خدا نے اُن کی طرف وحی کی کہ "سکینہ" کے پیچھے پیچھے چلو جہاں یہ رُک کے وہاں کعبہ بناؤ۔ اور یہ سکینہ ایک تیز ہوا تھی جس کے انسان جیسا منہ اور دو پر تھے اور اس میں قوت گویائی بھی تھی۔ اس نے خانۂ کعبہ کے مقام کو اپنے پروں سے جھاڑ دیا اور حضرت ابراہیم سے کہا کہ یہ صاف شدہ مقام محلِ کعبہ ہے۔ یہاں بیت اللہ کی تعمیر کرو۔

(۲) دوئم یہ کہ ایک ابر پارہ جس کے سر تھا حضرت ابراہیمؑ کی رہنمائی کے لئے متعین کیا گیا۔ اُس نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ جس جگہ میں ٹھہر جاؤں وہاں میرے سائے کے مطابق نشان لگا لینا وہی موضع خانۂ کعبہ ہوگا۔

(۳) سوئم یہ کہ حضرت جبرئیل علیہ السّلام نے اپنے پروں سے اُس جگہ کو جہاں خانۂ کعبہ تعمیر ہونا تھا صاف کر دیا اور حضرت ابراہیمؑ کو پرانی بنیادیں دکھلا دیں جن پر اب کعبہ بنایا جانا تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے ان ہی بنیادوں پر خانۂ کعبہ تعمیر کیا۔ (سیرۃ الحلبیہ جلد ۱، ص ۱۴۸، ۱۴۹ ملخصاً)

بہر کیف محل خانۂ کعبہ معلوم ہو گیا اور حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام بیت اللہ کی تعمیر میں مصروف ہو گئے اور حضرت آدمؑ کے زمانہ کی پرانی بنیادوں پر اُس کی تعمیر کرنے لگے۔ اسی واقعہ کا اس آیۂ کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے:۔

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّاؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (سورۂ بقرہ آیۃ ۱۲۷)

یعنی وہ وقت یاد کرو جب ابراہیمؑ و اسمٰعیل خانۂ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے اور (کہتے جاتے تھے) پروردگارا! ہماری یہ خدمت قبول کر لے۔ بے شک تو سمیع و علیم ہے۔

اس طرح جناب ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے خانۂ کعبہ کو پرانی بنیادوں پر تعمیر کیا۔ احادیث میں ہے کہ جب تعمیر مکمل ہو چکی تو حضرت جبرئیلؑ نے حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کو مناسک حج تعلیم کیے۔

تعمیر خانۂ کعبہ کی تکمیل کے بعد جناب ابراہیمؑ ریاست مکہ اور تولیت کعبہ اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کو سپرد کر کے شام واپس چلے گئے اور ہر سال حج کرنے آتے رہے۔ سیرۃ ہشامیہ میں ہے کہ "جب اسمٰعیل بن ابراہیم علیہما السلام کی وفات ہوئی تو بیت اللہ کی تولیت آپ کے فرزند نابت بن اسمٰعیل سے اس وقت تک متعلق رہی جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ ان کے بعد بیت اللہ کا متولی مضاض بن عمرو جرہمی ہوا۔

(سیرۃ ابن ہشام، جلد ۱، ص ۱۱۰)

بنو جرہم اور تولیت کعبہ

ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں کہ جس زمانہ میں جناب ابراہیمؑ نے اپنی زوجہ ہاجرہؑ اور اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کو سرزمین مکہ میں آباد کیا اور وہاں چاہ زمزم برآمد ہوا اسی زمانہ میں بنو جرہم بھی وہاں آباد ہو گئے۔ یہ قحطانی تھے اور ان کا اصل وطن یمن تھا۔ ان ہی میں ایک شخص مضاض بن عمرو تھا۔ جناب اسمٰعیلؑ نے جوان ہو کر اس کی لڑکی سے نکاح کر لیا اور اس سے پہلا لڑکا نابت پیدا ہوا۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی وفات کے بعد مکہ کی ریاست اور بیت اللہ کی تولیت نابت کو ملی۔

نابت نے اس حالت میں وفات پائی کہ اس کے بچے صغیر سن تھے۔ اس صورت میں اُن کے نانا مضاض بن عمرو نے اُن کی کفالت اور تولیت کعبہ کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لی۔ نابت کی اولاد و احفاد کے جوان ہو جانے پر بھی ریاست مکہ اور تولیت کعبہ بنو جرہم ہی کے قبضہ میں رہی اور بنو اسمٰعیل نے اُن سے کوئی مزاحمت نہیں کی کیونکہ وہ اُن کے نانا ماموں ہوتے تھے۔ اس سلسلہ میں ابن ہشام لکھتے ہیں :-

"اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کو خوب پھیلا دیا لیکن بیت اللہ کے متولّی اور حکام مکہ بنی جرہم ہی رہے جو اسمٰعیلؑ کے ماموں ہوتے تھے۔ اولاد اسمٰعیلؑ نے بنی جرہم سے حکومت کے متعلق کبھی نزاع نہ کی کیونکہ ایک تو وہ قرابت میں اُن کے ماموں ہوتے تھے اور دوسرے مکہ معظمہ کی عظمت و حرمت اس بات سے مانع تھی کہ اُس میں جنگ وجدال ہو" (اُردو ترجمہ سیرۃ ابن ہشام، جلد ۱، ص ۱۱۱)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پانچویں جدّ قصی بن کلاب کے رئیس مکہ اور متولی کعبہ ہونے سے پانچ سو برس پہلے تک ریاست مکہ اور تولیت خانہ کعبہ بنو جرہم کے قبضہ میں رہی۔ گو ان کی حکومت کے آخری زمانہ میں ظلم وستم کا بازار گرم ہوا لیکن بیت اللہ میں کوئی بت نصب نہیں ہوا۔ ان کے بعد مکہ کی حکومت

اور کعبہ کی تولیت پر بنو خزاعہ نے قبضہ کرلیا۔ یہ لوگ بھی اولاد اسمٰعیل سے نہیں تھے بلکہ قحطانی تھے اور ان کا اصل مسکن بھی یمن تھا۔

بنو خزاعہ اور تولیت کعبہ

بنو جرہم کا آخری رئیس و متولی کعبہ عمرو بن حارث جرہمی تھا۔ اس کے زمانہ میں بنو جرہم کی یہ حالت تھی کہ "انہوں نے سرکشی اختیار کرلی اور اس مقدس مقام کی عظمت و حرمت کا لحاظ نہ رکھا۔ مقامی باشندوں کے سوا جو لوگ وہاں جاتے ان پر ظلم اور کعبتہ اللہ کے لئے جو نذرانے گزارے جاتے، انہیں کھانے لگے۔ ان میں پھوٹ پڑ گئی۔ جب بنی بکر بن عبد مناۃ بن کنانہ اور غبشان نے جو بنی خزاعہ میں سے تھے یہ حالات دیکھے تو وہ بنی جرہم سے جنگ کرنے اور انھیں مکّہ سے نکال دینے پر متفق ہو گئے، چنانچہ جنگ ہوئی جس میں بنی بکر اور غبشان نے غلبہ پا لیا اور بنو جرہم کو جلا وطن کر دیا۔ عمرو بن حارث جرہمی نے کعبہ کے دونوں ہرن اور حجر اسود کو نکال کر زمزم میں دفن کر دیا اور بنو جرہم کو ساتھ لیکر یمن کی طرف چلا گیا" (اُردو ترجمہ سیرۃ ابن ہشام، جلد ۱، ص ۱۱۲)

"اس کے بعد بنی خزاعہ میں غبشان بیت اللہ کے متولی ہوئے اور بنی بکر بن عبد مناۃ نہ ہو سکے۔ ان میں کے متولی کا نام عمرو بن الحارث الغبشانی تھا" (ایضاً ص ۱۱۵)۔ "بیت اللہ کی تولیت بنی خزاعہ

میں وراثتہً یکے بعد دیگرے چلی آتی تھی یہاں تک کہ اُن کا آخری متولی حُلیل بن حبشیہ بن سلول بن کعب بن عمرو خزاعی ہوا"

(ایضاً ص ۵۱۰-۱۱) - عمرو بن الحارث الغبشانی کا ہی نام عمرو بن لُحَی ہے

عمرو بن لُحَی خزاعی پہلا شخص ہے جس نے کعبہ میں بُت نصب کئے

عمرو بن لُحَی خزاعی کے حالات ہم سیرت ابن ہشام، سیرۃ حلبیہ اور مِلَل و نِحَل شہرستانی سے ملخص کرکے ہدیۂ قارئین کرام کرتے ہیں۔

"عمرو بن لُحَی بڑا فیاض انسان تھا۔ اُس سے پہلے اور اُس کے بعد زمانۂ جاہلیت میں اُس سے بڑھ کر کوئی اور فیاض نہیں ہوا۔ کہتے ہیں کہ بعض سال ایامِ حج میں اُس نے دس دس ہزار اونٹ اور اُتنے ہی حُلّے حاجیوں میں تقسیم کئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اُس کو اپنا رب یعنی اَن داتا سمجھنے لگے اور جو بدعت بھی وہ جاری کرتا تھا اُس کو بخوشی قبول کرنے لگے بلکہ اس کے احکام کو دین کا مرتبہ دینے لگے۔

ایک دفعہ اس کو ملک شام میں سرزمین بلقاء میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں اس نے قوم عمالقہ کو بتوں کی پرستش کرتے دیکھا۔

اُن سے پوچھا کہ یہ کیا ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ بُت ہیں۔ جب ہمیں بارش کی ضرورت ہوتی ہے تو ان سے طلب کرتے ہیں۔ یہ بارش برساتے ہیں۔ جب ہمیں کوئی اور مدد درکار ہوتی ہے تو ان سے مانگتے ہیں۔ یہ ہماری مدد کرتے ہیں۔ عمرو نے کہا کہ ان میں سے ایک بُت مجھے بھی دیدو تاکہ میں مکہ میں لیجاکر لوگوں کو اُس کی پرستش پر آمادہ کروں چنانچہ انہوں نے "ہبل" بُت اُس کو دیا۔ عمرو نے اُس کو لاکر کعبہ میں نصب کر دیا اور لوگوں کو اُس کی پرستش کے لئے حکم دیا جو انھوں نے برضا و رغبت قبول کیا۔ اسی کے قریب اُس نے چند تیر رکھ دئے جن سے فال لینے کا طریقہ ایجاد کیا جن کو ازلام کہتے ہیں۔

اسی طرح دوسری دفعہ وہ دو بُت اِساف اور نائلہ لیکر آیا۔ یہ مرد و عورت کی شکل میں تھے۔ انہیں اُس نے چاہ زمزم کے پاس نصب کر دیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ ان کی تعظیم کریں، اُن کے ذریعہ تقرب حاصل کریں اور اپنی مشکل میں اُن کو وسیلہ بنائیں۔ عرب ان کے قریب قربانی کرتے تھے۔

اسی عمرو بن لُحَیّ نے قدید کے قریب دریا کے کنارے مناۃ بُت نصب کیا۔ بنی ازد۔ اوس۔ خزرج اور غسّان اس کی تعظیم کرتے تھے اور ہر سال اس کے حج کو جایا کرتے تھے۔

کہتے ہیں کہ عمرو بن لُحَیّ کے ایک جن تابع تھا۔ اس نے اُس کو حکم دیا کہ قوم نوح کے بُت وَدّ، سُواع، یغوث، یعوق اور نسر کو تلاش کر کے

لایا جائے۔ یہ جن گیا اور ساحل جدہ سے جہاں پر وہ بت دفن تھے انھیں نکال لایا۔ مختلف قبائل کے سرداران بتوں کو اپنے اپنے شہروں میں لے گئے اور اُن کی عبادت کرنے لگے۔

یہی شخص لات اور عزّیٰ بتوں کو لایا۔ اور اُن کے متعلق لوگوں سے کہا "اِنَّ الرَّبَّ یشتنی عند اللّات ویصیف عند العزّیٰ"، (سیرۃ الحلبیہ) یعنی اللہ موسم سرما لات کے پاس گزارتا ہے اور موسم گرما عزّیٰ کے پاس گزارتا ہے۔ قبیلۂ ثقیف لات بت کو طائف اور بنو سُلیم عزّیٰ کو مقام نخلہ میں لے گئے اور وہاں اُن کی پرستش کرنے لگے۔

اس طرح عمرو بن لُحی نے نہ صرف خانہ کعبہ میں بت نصب کئے بلکہ پورے عرب میں بُت پرستی کو رواج دیدیا۔ بُت پرستی کے علاوہ عمرو بن لُحی نے دیگر مشرکانہ حرکات بھی جاری کیں۔ اُس نے تلبیہ اس طرح شروع کیا:۔

لبّیک اللّٰھم لبّیک لبّیک لا شریک لک
الّا شریک ھو لک تملکہ وما ملک

ترجمہ:۔ ہم تیرے سامنے حاضر ہیں، اے اللہ ہم تیرے سامنے حاضر ہیں۔ ہم تیرے سامنے حاضر ہیں۔ تیرا کوئی شریک نہیں، بجز ایک شریک کے کہ وہ تیرا ہی ہے۔ تو اُس کا مالک ہے، وہ تیرا مالک نہیں۔

اس کے علاوہ اُس نے بتوں کے نام پر جانور چھوڑنے کا مشرکانہ طریقہ بھی ایجاد کیا۔ چنانچہ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام ایسے ہی جانور تھے۔ بحیرہ اُس اونٹنی کو کہتے تھے جس کا کان چیر کر بتوں کے نذر کرتے تھے۔ سائبہ وہ اونٹنی کہلاتی تھی جس کے متعلق کوئی شخص نذر کرتا کہ اگر اُس نے بیماری سے صحت پالی یا مقصد حاصل کرلیا تو وہ اُسے بتوں کے نام پر چھوڑ دے گا۔ وصیلہ وہ اونٹنی ہوتی تھی جس کی ماں ہر حمل میں دو دو بچے جنتی۔ مالک اُن میں سے ماداؤں کو بتوں کے لئے چھوڑ دیتا اور نروں کو خود اپنے لئے رکھ لیتا۔ حام اُس نر اونٹ کو کہتے تھے جس کے نطفہ سے متواتر دس مادائیں پیدا ہوتیں اور اُن کے درمیان کوئی نر نہ ہوتا۔ اُسے گلے میں چھوڑ دیا جاتا کہ اُس سے جفت ہوا کرتے۔ اس کے سوا اُس سے اور کوئی کام نہیں لیا جاتا۔

ان واقعات کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضور صلعم نے اکثم رضؓ سے کہا:۔

"میں نے عمرو بن لحی بن قمعہ بن خندف کو اس حال میں دیکھا کہ وہ دوزخ میں اپنی آنتیں گھسیٹے پھرتا ہے۔ اے اکثم! میں نے اُس کو سب سے زیادہ تم سے مشابہ پایا"۔ اکثم نے یہ سنکر عرض کیا: یارسول اللہ! کیا یہ مشابہت میرے لئے ضرر رساں ثابت ہوگی" آپ نے فرمایا: نہیں، کیونکہ تم مومن ہو اور وہ کافر تھا۔ وہ پہلا شخص

تھا جس نے بتوں کو نصب کیا اور بحیرہ۔ سائبہ، وصیلہ اور حام جانوروں کو بتوں کے نام پر چھوڑنے کا مشرکانہ طریقہ ایجاد کیا"

خدا کی شان کہ اس کافر مشرک کو حیات بھی طویل ملی۔ اس کی عمر تین سو چالیس برس ہوئی۔ کہتے ہیں کہ اس نے اپنی آنکھوں سے اپنے بیٹے، پوتے اور پروتے دیکھے اور اُن میں سے ایک ہزار میدان جنگ میں لڑنے والے مقاتل تھے۔ اس طرح اس نے پورے عرب میں بت پرستی اور شرک کو خاطر خواہ رواج دیا۔ یہ اور اس کی اولاد پانچ سو برس تک ریاست مکہ اور تولیت کعبہ پر متمکن رہی۔ اس کی نسل کا آخری رئیس حُلیل بن حبشیّہ خزاعی تھا جس کے بعد تولیت کعبہ قریش میں منتقل ہوئی۔ (سیرۃ حلبیہ جلد ۱، ص ۱۱، سیرۃ ہشامیہ جلد ۱، ص ۹۷ تا ۹۳)

قریش اور تولیت خانہ کعبہ

بنو خزاعہ کے آخری متولی کعبہ حُلیل بن حبشیّہ کے زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے پانچویں جد قصیّ بن کلاب ہوئے۔ ان کا نام زید اور بروا بیتے۔ یزید تھا قصیّ مشہور ہونے کی یہ وجہ ہوئی کہ ان کے باپ کلاب اِن کو حالت شیر خوارگی میں چھوڑ کر مر گئے۔ ان کی ماں فاطمہ نے ربیعہ بن خرام سے نکاح کر لیا جو ان کو بلاد قضاعہ ملک شام میں لے گئیں۔ چونکہ

ان کی پرورش ایک دور دراز ملک میں ہوئی اس لئے ان کا عرف قصّی ہو گیا۔ جب یہ جوان ہوئے تو مکہ لوٹ آئے۔ چونکہ یہ نہایت بااخلاق، کریم النفس، فیاض، دلیر اور قبائح سے متنفر واقع ہوئے تھے اس لئے قریش نے ان کو اپنا سردار تسلیم کرلیا اور وہ ان کی عظمت کرنے لگے۔

بنو خزاعہ کے ظلم وستم سے قبائل قریش مکہ کو چھوڑ کر منتشر ہو گئے تھے۔ انہوں نے اُن سب کو جمع کیا اور اس لئے ان کا لقب "مجمع" ہو گیا۔ انہوں نے حُلیل بن حبشیّہ متولی کعبہ کی لڑکی حُبیؓ سے شادی کا پیام دیا۔ جو قبول ہوا اور ان کی شادی حُبیؓ سے ہو گئی۔ حُلیل خزاعی کے ایک ہی لڑکی تھی اس لئے اُس نے مکہ کی ریاست اور کعبہ کی تولیت کی وصیت اپنے داماد قصّی کے حق میں کی۔ بنو خزاعہ کو یہ بات ناگوار ہوئی اور وہ قصّی سے آمادہ پیکار ہو گئے۔ قصّی نے بامداد قریش، بنو قضاعہ وغیرہ بنو خزاعہ سے مقابلہ کیا اور کافی کشت و خون ہوا۔ آخر ایک شخص یعمر بن عوف جانبین کی طرف سے ثالث مقرر ہوا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ قصّی بنو اسمٰعیل سے ہے اور ریاست مکہ اور تولیت کعبہ کا زیادہ مستحق ہے۔ اس طرح تولیت کعبہ اور ریاست مکہ قصّی کے قبضہ میں آئی۔ قصّی نے برسر اقتدار آتے ہی بت پرستی کے سلسلہ میں اپنا نظریہ ان الفاظ میں ظاہر کر دیا۔

اَرَبًّا وَاحِدًا اَمْ اَلْفَ رَبٍّ ۔۔۔ اَدِیْنُ اِذَا تَقَسَّمَتِ الْاُمُوْرُ

ترکتُ اللاتَ والعزّیٰ جمیعًا — کذٰلکَ یفعلُ الرّجلُ البصیرُ
فلا العُزّیٰ ادینُ ولا ابنتیھا — ولا صنمی بنی غنمٍ ازورُ

(الملل والنحل جلد ۲، ص ۲۴۸)

ترجمہ:۔ کیا میں ایک پروردگار کی عبادت کروں یا ایک ہزار کی جیسا کہ انھیں بانٹ رکھا ہے۔ میں نے لات اور عزّیٰ سب کو چھوڑ رکھا ہے اور صاحب بصیرت شخص ایسا ہی کرتا ہے۔

پس میں نہ عزّیٰ کی پوجا کرتا ہوں اور نہ اُس کی دونوں بیٹوں کی اور نہ میں بنی غنم کے دونوں بتوں کی زیارت کرتا ہوں۔

ہم نے "ترکتُ اللات والعزّیٰ" کا ترجمہ "میں نے لات اور عزّیٰ سب کو چھوڑ رکھا ہے" اس لئے کیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ قصیؑ نے کبھی بھی بُت پرستی نہیں کی۔ قرائن سے ہم اس ترجمہ پر مجبور ہوئے کیونکہ حضور صلعم کا یہ ارشاد ہے کہ میں ہمیشہ اصلاب طاہرین سے ارحام مطہرات میں منتقل ہوتا رہا اور قرینہ کی موجودگی میں ایسے معنی کرنا جائز ہیں۔ چنانچہ آیہ وافی ہدایہ "ربّنا وجعلنا مسلمین لک" کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام مسلمان تو تھے ہی۔ اُن کی اس دُعا کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اب تک ہم مسلمان نہیں۔ اب ہمیں مسلمان بنا دے بلکہ حقیقت میں "کانا مسلمین ولکنھما سالا اللہ الثبات" یعنی وہ مسلمان تو تھے ہی لیکن انہوں نے اس دُعا میں اسلام پر

ثابت قدم رہنے کی آرزو کی ہے (تفسیر ابن کثیر، جلد ۱، ص ۱۸۲)
قصیٰ کے جانشینوں کا بھی یہی مسلک رہا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ اشعار زید بن عمرو بن نفیل کے ہیں۔ چنانچہ سیرۃ ابن ہشام میں یہ تین اشعار اور اسی قافیہ میں اور کئی اشعار زید بن عمرو بن نُفیل سے ہی منسوب ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ قصیّ کے یہ اشعار اتنے مشہور ہو گئے ہوں کہ زید بن عمرو نے اپنے اشعار کی ابتداء ان ہی اشعار سے کی ہو اور اس سے زید کا مطلب یہ ہو کہ توحید پرستی میں میں ہی منفرد نہیں ہوں بلکہ مجھ سے بہتر ہستی قصیّ کا بھی یہ ہی مسلک تھا۔

بہر کیف تاریخ شاہد ہے کہ قصیّ بن کلاب کے زمانے سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے عہد سعادت مہد تک کوئی بت خانہ کعبہ میں نصب نہیں کیا گیا۔

دُنیا جانتی ہے کہ انقلابات کی دُنیا میں ماہ و سال کا یہ عام پیمانہ نہیں ہے جو دُنیا میں رائج ہے۔ وہاں سال صدیوں کے برابر ہوتے ہیں۔ قصیّ کے برسر اقتدار آنے کے قریب سو سال بعد اُن کے نورِ نظر جناب احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ علیہ افضل التحیات والثنا نے نہ صرف خانۂ کعبہ کو بتوں سے پاک و صاف کیا بلکہ سرزمین عرب سے اصنام پرستی کا ایسا استیصال کیا کہ آج تک وہاں بُت پرستی کا نام نہیں اور نہ انشاء اللہ قیامت تک وہاں بت پرستی دخل پا سکے گی۔

اس منزل پر ایک اور سوال وارد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ بے شک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباء کرام از قصی تا ابو طالب کے زمانہ میں کوئی بت تو خانہ کعبہ میں نصب نہیں ہوا لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ یہ لوگ بحیثیت متولی خانۂ کعبہ بتوں کے چڑھاوے کی رقم حجاج کے کھانے پینے اور دیگر ضروریات حج پر خرچ کرتے تھے اور کیا ایسا کرنا منافیٔ توحید پرستی نہیں۔ اس سوال کا جواب ہم انشاء اللہ آیندہ باب میں پیش کریں گے۔

باب ہفتم

اس سوال کے جواب میں کہ کیا یہ حقیقت نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباء کرام از قصیّ تا ابوطالب بحیثیت متولیان خانۂ کعبہ بتوں کے چڑھاوے کی رقم مستحق حجاج کے کھانے پینے اور دیگر مصارف حج پر خرچ کرتے تھے

یہ اعتراض کہ آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباء کرام از قصیّ تا ابوطالب بحیثیت متولیان خانۂ کعبہ بتوں پر چڑھاوے کی رقم ضرورت مند حاجیوں کے کھانے پینے اور دیگر مصارف

حج پر خرچ نہیں کرتے تھے تاریخی ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوتا ہے ہم اس سوال کے جواب کا آغاز قرآن مجید کے سورۂ قریش سے کریں گے جس کا متن یہ ہے:۔

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۙ اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ۚ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ ۙ الَّذِیْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۠

چونکہ قریش کو جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس کر دیا ہے تو اُن کو مانوس کر دینے کی وجہ سے اس گھر (کعبہ) کے مالک کی عبادت کرنی چاہیئے جس نے اُن کو بھوک میں کھانا دیا اور اُن کو خوف سے امن عطا کیا

اس سورہ میں اس واقعہ کی خبر دی گئی ہے کہ قریش تجارت کیا کرتے تھے۔

قریش سے کون لوگ مراد ہیں

اب غور طلب چیز یہ ہے کہ قریش کا اطلاق کن لوگوں پر ہوتا ہے تاکہ یہ متحقق ہو سکے کہ قریش کس زمانے سے تجارت کا پیشہ کیا کرتے تھے۔ کتب سیر و تواریخ کے دیکھنے سے اس سلسلہ میں پانچ اقوال ملتے ہیں۔

(۱) قول اوّل یہ ہے کہ قریش کا اطلاق قصّی اور اُس کی اولاد پر ہوتا ہے۔ "فلا یقال لاحدٍ من اولاد من فوقہ قرشیٌ"

اور اس لئے قصیٰ سے اوپر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو اجداد گذرے ہیں اُن کی اولاد کو قریش نہیں کہا جا سکتا۔
(سیرۃ الحلبیہ، جلد ا، ص ۱۵)

(۲) قول دوئم یہ ہے کہ فہر بن مالک (جو قصیٰ کے دادا کے دادا تھے) کا نام قریش ہے، پس جو شخص فہر کی اولاد میں ہوگا وہ قریشی کہلائے گا اور جو فہر کی اولاد میں نہ ہوگا وہ قریشی نہ سمجھا جائے گا (اُردو ترجمہ سیرۃ ابن ہشام، جلد ا، ص ۹۶)

(۳) قول سوم یہ ہے کہ نضر (فہر کے دادا) کا نام قریش ہے، جو شخص کہ نضر کی اولاد میں ہوگا وہی قریشی کہلائے گا اور جو نضر کی اولاد میں سے نہ ہوگا وہ قریشی بھی نہ ہوگا"
(اُردو ترجمہ سیرۃ ابن ہشام، جلد ا، ص ۹۶)

(۴) قول چہارم یہ ہے کہ الیاس (جو نضر کے دادا کے دادا تھے) کا نام قریش ہے۔ "فلا یقال لاولاد من فوقه قرشی" اس لئے الیاس سے اوپر کی پشتوں کی اولاد کو قریشی نہیں کہا جائے گا۔ (سیرۃ الحلبیہ، جلد ا، ص ۱۶)

(۵) قول پنجم یہ ہے کہ الیاس کے باپ مضر کا نام قریش ہے۔ "فلا یقال لاولاد من فوق مضر قرشی" اس لئے مضر سے اوپر کی پشتوں کی اولاد کو قریشی نہیں سمجھا جائے گا۔
(سیرۃ الحلبیہ، جلد ا، ص ۱۶)۔

ان اقوال پنجگانہ میں سے جس قول کی تائید حدیث رسولؐ سے ہوتی ہے وہ نضر کے متعلق ہے۔ چنانچہ صاحب سیرۃ الحلبیہ لکھتے ہیں:-

فقد سُئِلَ رسولُ اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلّم من قریشٍ فقال مِنْ وُلْدِ النضر،

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ قریش کون لوگ ہیں۔ آپ نے فرمایا اولاد نضر قریش ہیں۔

(سیرۃ الحلبیہ، جلد ۱، ص ۱۶)

اور غالباً اسی وجہ سے جمہور علمائے اسلام اس طرف گئے ہیں کہ قریش سے مراد اولاد نضر بن کنانہ ہیں۔ چنانچہ شیخ طبرسی تفسیر مجمع البیان میں لکھتے ہیں:

وَ امّا قریشٍ فهم ولد النضر بن کنانۃ، فکل من ولدہ النضر فهو قرشی، ومن لم یلدہ النضر فلیس بقرشیٍّ۔

لیکن جہاں تک قریش کا تعلق ہے تو وہ نضر بن کنانہ کی اولاد ہیں۔ پس ہر وہ شخص جو نضر کی اولاد سے ہوگا وہ قرشی ہوگا اور جو نضر کی اولاد نہیں وہ قرشی نہیں۔

(تفسیر مجمع البیان، جلد ۵، ص ۵۴۵)

قریش کی وجوہ تسمیہ

نضر بن کنانہ کا نام قریش کیوں پڑا، اس کے متعلق چار قول

منقول ہیں:-

(۱) قول اوّل یہ ہے کہ قریش ایک عظیم الجثہ دریائی جانور ہوتا ہے جو تمام دریائی مچھلیوں کو کھا جاتا ہے اور سب پر غالب رہتا ہے اور اُس پر کوئی غالب نہیں ہوتا۔ چونکہ نضر اپنی قوم میں سب سے زیادہ عالی مرتبہ اور فائق تھا اس وجہ سے اُس کا لقب قریش پڑ گیا۔

(۲) قول دوم یہ ہے کہ قریش "تقرّش" سے ماخوذ ہے جس کے معنی جمع ہونے کے ہیں۔ چونکہ متفرق قبیلوں کے ضرورت مند لوگ جو حج کے موقع پر آتے تھے ضیافت کے سلسلہ میں نضر کے گھر میں جمع ہوا کرتے تھے اس لئے اُس کا لقب قریش ہو گیا۔

(۳) قول سوم یہ ہے کہ قریش "تقریش" سے ماخوذ ہے جس کے معنی محتاجوں کی خبر گیری لینے کے ہیں۔ چونکہ نضر ہمیشہ محتاجوں کے حالات کی تلاش و جستجو کیا کرتا تھا اس مناسبت سے اُس کو قریش کہا جانے لگا۔

(۴) قول چہارم یہ ہے کہ قریش "قرش" سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسب معیشت کے ہیں۔ چونکہ نضر ہمیشہ تجارت سے کسب معاش کرتا تھا اس لئے وہ قریش کے لقب سے ملقب ہو گیا۔ (مدارج النبوۃ للشیخ عبدالحق دہلوی، جلد ۲

ص ۱۱ و ۱۲، معارج النبوۃ للکاشفی، رکن اول ص ۴۸)

ان تمام اقوال میں چوتھا قول معتبر معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ قرآن کی آیت "لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ" کے مطابق ہے جو قریش سے موسم سرما اور موسم گرما میں تجارتی سفروں کو منسوب کرتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ علمائے اسلام نے دیگر اقوال کے مقابلہ میں اس قول کو اختیار کیا ہے چنانچہ ابن ہشام کہتے ہیں: "قریش کا نام قریش اس لئے مشہور ہوگیا کہ تقرش کے معنی اکتساب و تجارت کے ہیں"۔

(اُردو ترجمہ سیرۃ ابن ہشام، جلد ۱، ص ۹۶)

شیخ طبرسی جو مفسرین امامیہ میں ایک مشہور ہستی ہیں اپنی تفسیر مجمع البیان، میں لکھتے ہیں: قریش کا نام قریش اس لئے ہوا کہ وہ تجارت کرتے تھے اور تجارت کے لئے مال لاتے لیجاتے تھے۔ یہ لوگ اہل تجارت تھے۔ مال مویشی اور کھیتی کیاری والے نہیں تھے۔ (تفسیر مجمع البیان، جلد ۵، ص ۵۷۵)۔

خلاصۂ مبحث یہ ہوا کہ نضر بن کنانہ کا لقب قریش ہوا اور وہ اس وجہ سے کہ وہ تجارت میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ چونکہ اُس کی اولاد و احفاد نے بھی تجارت ہی کو اپنا ذریعۂ معاش بنائے رکھا اس لئے وہ سب قریش کہلانے لگے۔ نضر بن کنانہ سے اوپر کی پشتوں کی اولاد پر لفظ قریش کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

قریش کا تجارت میں انہماک

یوں تو نضر بن کنانہ اور اُس کی اولاد و احفاد نے تجارت کو ہی اپنا مشغلہ بنائے رکھا لیکن چونکہ بنو خزاعہ کے ظلم و ستم کی وجہ سے اُن کی کثیر تعداد کو مکہ چھوڑ کر دیگر مقامات پر آباد ہونا پڑا اس لئے وہ تجارت میں کوئی نمایاں مقام حاصل نہ کر سکے۔ جب قصیّ بن کلاب نے بنو خزاعہ کو شکست دیکر ریاست مکہ اور تولیت خانہ کعبہ حاصل کی اور اُس کو پورا اقتدار حاصل ہو گیا تو اُس نے قبائل قریش کو جو مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے تھے پھر مکہ میں جمع کیا اور انہیں وہاں آباد کیا۔ اسی وجہ سے قصیّ کا لقب مجمّع مشہور ہو گیا چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:۔

قُصَیٌّ لَعَمْرِی کَانَ یُدْعٰی مُجَمِّعًا   بِہٖ جَمَعَ اللّٰہُ القَبَائِلَ مِنْ فِہْرِ

ترجمہ:۔ میری عمر کی قسم! قصیّ جو مجمّع کے نام سے مشہور تھا اُسی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے بنو فہر کے تمام قبیلوں کو جمع کر دیا۔ (سیرۃ ہشامیہ، جلد ۱، ص ۱۲۴) اس زمانہ سے قریش نے تجارت میں نمایاں ترقی کی۔

سب سے زیادہ ترقی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پردادا ہاشم ابن عبد مناف کے زمانہ میں ہوئی۔ ان کے متعلق علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:۔

"ہاشم نے تجارت کو نہایت ترقی دی۔ قیصر روم سے خط و کتابت کر کے فرمان لکھوایا کہ قریش جب اُس کے ملک میں اسباب تجارت لیکر جائیں تو اُن سے کوئی ٹیکس نہ لیا جائے۔ حبش کے بادشاہ نجاشی سے بھی اسی قسم کا فرمان حاصل کیا۔ چنانچہ اہل عرب جاڑوں میں یمن اور گرمیوں میں شام اور ایشیائے کوچک تک تجارت کے لیئے جایا کرتے تھے، اُس زمانہ میں انگوریہ (انقرہ) جو ایشیائے کوچک کا مشہور شہر ہے قیصر کا پایۂ تخت تھا۔ تُجّار قریش انگوریہ میں جاتے تھے تو قیصر نہایت عزت اور حُرمت سے خیر مقدم کرتا تھا۔

عرب میں راستے محفوظ نہ تھے۔ ہاشم نے مختلف قبائل میں دورہ کر کے اُن سے یہ معاہدہ کیا کہ وہ قریش کے کاروان تجارت کو ضرر نہ پہونچائیں گے۔ جس کے صلہ میں کاروان قریش اُن قبائل میں ضرورت کی چیزیں خود لیکر جائے گا اور اُن سے خرید و فروخت کرے گا۔ یہ سبب تھا کہ عرب میں باوجود عام لوٹ مار کے قریش کا قافلۂ تجارت ہمیشہ محفوظ رہتا تھا"۔ (سیرۃ النبی، جلد ۱، ص ۱۲۰)

ہاشم ہی کی وہ شخصیت ہے جس نے سب سے پہلے قریش کے لیئے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ وہ موسم سرما میں یمن اور موسم گرما میں شام اور عراق کی طرف تجارت کے لیئے سفر کیا کریں جس کی خبر سورۂ قریش میں "رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ" کے الفاظ میں دی گئی ہے۔ یہ

معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہاشم نے یہ سرمائی اور گرمائی تجارتی سفروں کا قاعدہ کیوں مقرر کیا۔ اس سلسلہ میں علامہ سیوطی تفسیر دُرِّ منثور میں لکھتے ہیں :۔

"قریش کا دستور تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں احتفاد کرتے تھے۔ اور اُن کا احتفاد یہ تھا کہ جب کسی خاندان کا مال و متاع ختم ہو جاتا اور اُن کے پاس کچھ بھی نہ رہتا تو وہ گھر بار چھوڑ کر اپنی بستی سے باہر میدان میں چلے جاتے اور اپنے اوپر خیمے ڈال کر اُن میں پڑ جاتے تھے۔ اس کام کو وہ باری باری کرتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ اُسی کے اندر مر کر سب ختم ہو جاتے۔ اور دوسرے لوگوں کو اُن کی پریشانی اور تنگ حالی کی خبر بھی نہ ہونے پاتی تھی۔ یہی طریقہ اُن میں رائج رہا یہاں تک کہ ہاشم جوان ہوئے۔ جب اُن کی قوم یعنی قبیلہ قریش میں اُن کی بزرگی اور شرافت مسلم اور اُن کی قدر عظیم الشان ہو گئی تو اُنھوں نے اُن لوگوں میں یہ خطبہ دیا۔ معشر قریش! خوب سمجھ لو کہ وہی لوگ دوسروں پر غالب رہ سکتے ہیں جن کی تعداد زیادہ ہوگی۔ تم لوگ مال کے اعتبار سے عرب میں سب سے زیادہ اور تعداد کے لحاظ سے سب سے بڑھے ہوئے ہو مگر میں دیکھتا ہوں کہ یہ احتفاد کی مصیبت تم لوگوں کو ختم کیے دیتی ہے۔ اس پر میں نے غور و فکر کر کے ایک تدبیر سوچی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ آپ کی تدبیر یقیناً بہتر اور ہم سب کی بھلائی کی

ہی ہوگی۔ آپ نے جو تدبیر سوچی ہے بے تکلف اُس کو ظاہر فرمائیں تاکہ ہم سب اُس پر عمل کریں۔ تب آپ نے کہا: میری رائے یہ ہے کہ تم لوگوں میں جو فقیر اور نادار ہیں اُن کو مالدار اور خوش حال لوگوں سے ملادوں اس طرح کہ ایک مالدار کو راضی کرکے اُس کے ساتھ ایک فقیر کو کردوں جس کے عیال اُسی قدر ہوں جس قدر اُس مالدار کے ہوں۔ اور یہ فقیر اُس مالدار کی مدد اُن تجارتی سفروں میں کرے جو وہ گرمی میں شام کی طرف اور جاڑے میں یمن کی طرف کرتے رہیں گے۔ اس طرح مال دار کے مال میں جو زیادتی ہوگی اُس سے وہ فقیر اور اُس کے عیال بھی اُس مالدار کے سایہ میں بسر کرلیا کرینگے۔ اور یہی عمل تم لوگوں کے احتفاد کی مصیبت کا خاتمہ کردے گا جناب ہاشم کی یہ تقریر سنکر سب نے کہا کہ آپ نے کیسی اچھی تدبیر سوچی ہے۔ اس طرح جناب ہاشم نے اُن قریش والوں میں ایک کو دوسرے کا دوست اور ساتھی بنادیا" (تاریخ ائمہ مؤلفہ مولانا علی حیدر صاحب بحوالہ تفسیر دُر منثور جلد ۶ ص ۲۹۷)

قریش کو احتفاد کی مصیبت سے نجات دلانے کا واقعہ جناب ہاشم کی زندگی کا ایک ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے کہ اس کی تعریف میں شعراء نے مدحیہ اشعار کہے چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے :-

الخالطین غنیھم بفقیرھم حتّٰی یعود فقیرھم کالکافی

ترجمہ :۔ (آل عبد مناف یعنی جناب ہاشم اور اُن کے قبیلہ والے ایسے کریم النفس ہیں کہ) وہ اپنے مالداروں کو اپنے مفلوک الحال لوگوں سے ملا دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں اُن کا مفلوک الحال شخص بھی خود کفیل ہو جاتا ہے۔

یہ وہ شعر ہے جس کی تصدیق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی کی ہے۔ چنانچہ صاحب سیرۃ الحلبیہ لکھتے ہیں :۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبو شیبہ کے دروازے کے پاس سے گزرے تو دیکھا کہ کوئی شخص یہ اشعار پڑھ رہا ہے :

یا ایھا الرجل المحوّل رحلہ ھلّا نزلت بآل عبد الدار

ھبلتک اُمک لو نزلت برحلھم منعوک عن عدم وعن اقتار

ترجمہ :۔ اے وہ شخص جو (مفلوک الحالی کی وجہ سے) اپنی قیام گاہ کو بدل رہا ہے تو آل عبد الدار کے پاس کیوں نہیں اُترا تیری ماں تجھے کھوئے اگر تو اُن لوگوں کی منزل میں اُترتا تو وہ تجھکو مفلسی اور مفلوک الحالی سے بچا لیتے۔

یہ سن کر آپ نے حضرت ابو بکر رضؓ سے جو اُس وقت آپ کے ہمراہ تھے دریافت کیا کہ کیا شاعر نے یہ اشعار اسی طرح کہے ہیں۔ اس پر انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ اُس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا یہ اشعار شاعر نے اسطرح کہے ہیں :

یا ایھا الرجل المحوّل رحلہ   ھلّا نزلت بآل عبد مناف

ھبلتک امک لو نزلت برحلھم   منعوک من عدم ومن اقراف

الخالطین غنیھم بفقیرھم   حتی یعود فقیرھم کالکافی

(ترجمہ): اے وہ شخص جو مفلسی اور ناداری کی وجہ سے ترک سکونت کر رہا ہے تو آلِ عبد مناف (ہاشم وغیرہ) کی منزل میں کیوں نہیں اُترتا۔ تیری ماں تجھے کھوئے اگر تو اُن کی منزل میں اُترتا تو وہ لوگ تجھے مفلسی اور بُرائی سے بچا لیتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے مالداروں کے ساتھ اپنے ناداروں کو ملا دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں اُن کا نادار بھی خود کفیل ہو جاتا ہے۔

یہ سُنکر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مُسکرائے اور فرمایا: ھکذا اسمعت الرواۃ ینشدونہ، یعنی میں نے بھی اشعار ذکر کرنے والوں سے یہ اشعار اسی طرح سُنے ہیں۔

(سیرۃ الحلبیہ، جلد ۱، ص ۵)۔ تفسیر مجمع البیان میں بھی سورۃ قریش کی تفسیر میں بھی یہ اشعار اسی طرح درج ہیں۔

سوشلزم یعنی اشتراکیت کے علمبرداروں کے لئے جناب ہاشم کی زندگی کا یہ کارنامہ جس کو چودہ سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے آج بھی مشعل راہ بن سکتا ہے کہ اُنھوں نے کس خوبی کے ساتھ مالداروں اور ناداروں، سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان ناہمواری کو دور کیا، اس خوبی کے ساتھ

کہ نہ اس تحریک کا مذہب پر کوئی اثر پڑتا ہے، نہ سرمایہ داروں کو مزدوروں سے کوئی شکایت کا موقع ملتا ہے اور نہ مزدوروں کو سرمایہ داروں کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔

ایام حج میں حاجیوں کے متعلق متولیان کعبہ کے مصارف

ہم باب سابق میں ذکر کر چکے ہیں کہ قصیٰ بنو خزاعہ سے جو قریب پانچ سو سال تک رئیس مکہ اور متولی خانۂ کعبہ رہ چکے تھے، ریاست مکہ اور تولیت کعبہ چھین کر اپنے تصرف میں لے آیا۔ جب اُس کو اقتدار حاصل ہو گیا تو اُس نے ریاست مکہ کے انتظام کے سلسلہ میں چار عہدے قائم کئے جو یہ تھے:

(۱) قیادت یعنی جنگ کے وقت لشکر کی سپہ سالاری کرنے کی خدمت۔

(۲) لواء یعنی لڑائی کے وقت علم برداری کی خدمت۔

(۳) حجابتہ یعنی خدا کے مقدس گھر کی حفاظت کی خدمت۔

(۴) ندوہ یعنی دار الندوہ میں صدر انجمن بننے کا استحقاق۔

اور تولیت خانۂ کعبہ کے سلسلہ میں حجاج کی دیکھ بھال کے لئے دو عہدے قائم کئے جو یہ تھے۔

(۱) ایسے حاجیوں کو جن کے پاس زادِ راہ ختم ہو گیا ہو یا جو غریب ہوں کھانا دینے کی خدمت، اس کو رِفادہ کہتے تھے۔

(۲) کھجوروں اور منقوں سے میٹھا کیا ہوا پانی پلانے کی خدمت۔ اس کو سقایہ کہتے تھے۔

قصیّ کے زمانے میں یہ سب عہدے اُسی کے پاس رہے۔ قصیّ کا سب سے بڑا لڑکا عبدالدار فضل و شرف میں اُس کے دوسرے لڑکوں کا ہم پلّہ نہیں تھا۔ اس لئے اُس کا وقار قائم رکھنے کی غرض سے قصیّ نے اپنے مرنے سے پہلے یہ تمام عہدے اُس کے سپرد کئے۔ عبدالدار کے مرنے کے بعد آل عبد مناف یعنی عبدالدار کے بھتیجوں ہاشم، عبد شمس، مطلب اور نوفل نے آل عبدالدار کی نااہلیت دیکھ کر آپس میں یہ عہد کیا کہ یہ مناصب اُن سے لے لئے جائیں۔ دونوں فریق جنگ کے لئے تیار ہو چکے تھے مگر خوش قسمتی سے باہمی صلح ہو گئی اور یہ طے پایا کہ قیادت، رِفادت اور سقایہ بنو عبد مناف کے حوالے کر دئے جائیں، ندوہ دونوں فریقوں میں مشترک رہے اور لِواء و حجابۃ کے عہدے بنو عبدالدار کے پاس رہیں۔

(سیرۃ الحلبیہ، جلد ۱، ص ۱۳)

یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ گو لِواء اور حجابۃ کے عہدے بنو عبدالدار کے قبضہ میں رہے لیکن بحیثیت رئیس مکہ اُن پر نگرانی آل عبد مناف کی ہی رہی۔

بہرکیف حجاج کی خدمت سے متعلق جو دو منصب رفادۃ اور سقایۃ کے تھے وہ بحیثیت متولی کعبہ بنو عبد مناف کے ہی قبضہ میں رہے۔ عبد مناف کے بعد ان عہدوں پر ہاشم، اُن کے بعد عبد المطلب اور اُن کے بعد اُن کے فرزند ابو طالب فائز رہے۔

رفادہ کے متعلق ابن ہشام لکھتے ہیں: رفادہ ایک طرح کا خراج تھا جو موسم حج میں قریش قصیٰ بن کلاب کے حوالے کیا کرتے تھے اور وہ اس رقم سے اُن حاجیوں کے لیے کھانا تیار کراتا تھا جن کے پاس زادراہ نہ ہوتا، جو غریب ہوتے۔ اس خراج کو قصیٰ نے قریش پر لازمی گردانا تھا۔ جب خراج کا حکم دیا تو کہا تھا: " اے گروہ قریش تم اللہ کے پڑوسی، اللہ کے گھر اور اُس کے حرم کے پاس رہنے ہو۔ حجاج اللہ کے مہمان ہیں۔ اُس کے گھر کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ اور تمام مہمانوں میں سب سے زیادہ عزت و اکرام کے مستحق وہ ہیں۔ اس لئے حج کے زمانے میں اُن کے لئے کھانا پانی تیار رکھو جب تک کہ وہ تمہارے پاس سے واپس نہ چلے جائیں۔ قریش نے یہ بات مان لی۔ چنانچہ وہ ہر سال اپنے مال سے اس غرض کے لئے مال نکالتے اور قصیٰ کے حوالہ کر دیتے۔ وہ منیٰ میں حاجیوں کے زمانہ قیام میں کھانا تیار کراتا۔ اُس کا یہ حکم زمانہ جاہلیت میں بھی قوم پر برابر جاری رہا یہاں تک کہ اسلام آیا، زمانہ اسلام میں بھی

آج تک وہی طریقہ جاری ہے" (سیرۃ ابن ہشام، جلد ا، ص ۱۲۸، ۱۲۹)

قارئین کرام نے مذکورہ بالا اقتباس سے دیکھ لیا ہو گا کہ رفادہ اور سقایہ پر قصیؔ ابن کلاب کے زمانے سے جو رقم صرف کی جاتی تھی وہ قریش کے اموال کا ایک حصّہ بطور ٹیکس ہوتا تھا۔ اس رقم کا بتوں کے چڑھاووں سے کوئی بھی واسطہ نہیں ہوتا تھا۔ اس موقع جناب ہاشم جو خطبہ دیا کرتے تھے اُس سے یہ حقیقت حال اور زیادہ نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ چنانچہ صاحب سیرۃ الحلبیہ لکھتے ہیں :۔

"جس رات ذی الحجہ کا چاند دکھائی دیتا ہاشم اُس کی صبح کو تمام قبائل قریش کو جمع کرتے اور خود کعبہ کی دیوار سے پشت لگا کر دروازے کے سامنے مُنہ کر کے کھڑے ہوتے اور ایک نہایت موثر خطبہ پڑھتے۔ خطبہ میں عمائدین قریش کو مخاطب کر کے کہتے : معاشر قریش! تم عرب کے سردار ہو۔ تمہاری وجاہت اور شرافت نسب اور ہوش مندی کا شہرہ عرب کے گوشے گوشے میں گونج رہا ہے۔ اور تمہاری فضیلت و بزرگی ہمارے حجاز کو تسلیم ہے۔ تم خدا کے مقدس معبد کے ہمسائے اور اس کے محافظ قرار دئے گئے ہو۔ خدا نے اپنی ولایۃ اور اپنے حق جوار کی وجہ سے تمام بنی اسمٰعیلؑ میں تمہیں ممتاز فرمایا اور اپنے معزز

گھر کی محافظت اور خبر گیری کی خدمت تمہارے ہاتھ میں دیکر تمہیں
خصوصیت کا تمغہ عنایت کیا ہے۔ جو لوگ خدا کے اس تقدس مآب
گھر کی زیارت کو آتے اور اُس کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں وہ درحقیقت
خدا کے مہمان ہیں اور خدا کے مہمانوں کی خاطر و مدارات کرنے
کے سبب سے پہلے تم مستحق ہو۔ پس خدا کے مہمانوں اور اُس کے
گھر کے زائروں کی خوش دلی سے تعظیم و توقیر کرو اور اُن کو
پیٹ بھر کر کھانا پانی دو۔ میں اس مقدس معبد کے پروردگار کی
قسم کھاکر کہتا ہوں کہ اگر میرے پاس اس قدر دولت ہوتی
جس سے یہ سارے کام چل جاتے تو میں تمہیں ایک درہم کی
بھی تکلیف نہ دیتا اور بے دریغ اپنی ساری دولت خدا کے
مہمانوں کی خدمت میں خرچ کر ڈالتا۔ میں اس موقع پر اپنی حلال
کمائی اور اپنے طیب مال میں سے وہ رقم نکال کر چندہ
میں دیتا ہوں جس میں نہ تو قطع رحمی کا شائبہ ہے، نہ ظلم سے
جمع کی گئی ہے اور نہ جس میں حرام مال شامل ہے۔ تو تم میں سے
بھی جو شخص چاہے تنگ دلی سے نہیں بلکہ خوش دلی کے ساتھ
ایسا ہی کرے۔ لیکن ساتھ ہی میں تمہیں بھی اس مقدس معبد
کی حرمت و عظمت کی قسم دلاتا ہوں کہ جو مال خانہ خدا کے
زائروں کی مہمانی اور اُن کی خاطر و مدارات کے لئے نکالو
وہ بالکل طیب و طاہر ہو، ظلم سے حاصل نہ کیا گیا ہو، اس میں

قطع رحمی کا شائبہ بھی نہ ہوا ور نہ وہ کسی کا مال غصب کر کے حاصل کیا گیا ہو" غرض جب ہاشم اس طرح کا خطبہ پڑھ کر فارغ ہوتے تو سامعین اس قسم کا مال جمع کرنے میں ان تھک کوشش کرتے اور بہت سا مال اکٹھا کر کے دار الندوہ میں جناب ہاشم کے پاس پہونچا دیتے۔ (سیرۃ الحلبیہ، جلد ۱، ص ۶)۔

جناب ہاشم کے اس خطبہ کو دیکھنے کے بعد تو کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی کہ متولی خانہ کعبہ حاجیوں کے کھانے پینے پر جو رقم صرف کرتا تھا وہ بالکل طیب و طاہر ہوتی تھی، اُس میں حرام مال از قسم نذرانہ اصنام بالکل شامل نہیں ہوتا تھا۔

اس حقیقت پر تاریخ کے ایک اور واقعہ سے بھی روشنی پڑتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب جناب عبد المطلب کے انتقال کے بعد مکہ کی ریاست اور خانہ کعبہ کی تولیت جناب ابوطالب کو ملی تو ایک سال ایسا اتفاق ہوا کہ چندہ کی جو رقم جمع ہوئی وہ حُجاج کے کھانے پینے کے انتظام کے لئے کافی نہیں تھی۔ جناب ابوطالب کے پاس بھی اتنی رقم نہیں تھی کہ جس کو ملا کر انتظام مکمل کر لیا جاتا۔ جناب ابوطالب نے اس نازک موقع پر بھی حرام مال کو کام میں نہیں لیا بلکہ جناب عباسؓ سے دس ہزار درہم قرض لیکر حجاج کے کھانے پینے کا انتظام کیا۔ اتفاقاً

دوسرے سال بھی یہ ہی صورت حال پیش آئی۔ جناب ابوطالب نے پھر جناب عباس سے اس کام کے لئے چودہ ہزار درہم قرض مانگے اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ سال پورا قرضہ ادا کر دیں گے۔ اس مرتبہ جناب عباس نے اس شرط پر قرضہ دینا منظور کیا کہ اگر آئندہ سال وہ ادائیگی نہ کر سکیں گے تو عہدۂ سقایۃ اُن کو منتقل کر دیں گے۔ جناب ابوطالب نے یہ شرط قبول کی اور چودہ ہزار درہم قرضہ لیکر حجاج کے کھانے پینے کا انتظام کیا۔ آئندہ سال بھی یہ قرضہ ادا نہ ہو سکا اور جناب ابوطالب نے حسب وعدہ عہدۂ سقایتہ حضرت عباس کو منتقل کر دیا جس پر سفاح کے زمانے تک بنو عباس قابض رہے اور اس کے بعد انہوں نے اس عہدہ کو چھوڑ دیا (سیرۃ الحلبیہ، جلد ۱، ص ۱۴۱)

ایام حج میں حجاج کے کھانے پینے پر جو رقم صرف ہوتی تھی اُس کے پاک و طیّب ہونے کا کس قدر خیال رکھا جاتا تھا، یہ مذکورہ بالا واقعہ سے روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ جناب ابوطالب نے عہدۂ سقایتہ کو خیرباد کہنا منظور کیا لیکن اس رقم میں بتوں کے چڑھاوے وغیرہ کے حرام مال کو شامل کرنا گوارا نہیں کیا۔

مذکورہ بالا شواہد سے یہ اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباء کرام از قصیٰ تا ابوطالب نے

بحیثیت متولیان خانۂ کعبہ بتوں کے چڑھاوے کی رقم مستحق حجاج کے کھانے پینے اور دیگر مصارف حج پر کبھی خرچ نہیں کی

۲۱ ستمبر ۱۹۶۶ء

فہرست مطالبِ کتاب حُسنِ آباء النبیؐ

مؤلف کی دیگر مطبوعات

آئینۂ حقائق

کتاب "خلافت معاویہ و یزید" کے اہم گوشوں پر نقد و تبصرہ

مؤلف: سیّد حشمت حسین جعفری ایڈوکیٹ حیدرآباد۔

یہ کتاب جناب محمود احمد صاحب عباسی کی کتاب "خلافت معاویہ و یزید" کے جواب میں لکھی گئی ہے جس میں ان کی مزعومہ تحقیق کے تار پود کو بکھیر کر رکھدیا گیا ہے مختصر ہونے کے باوجود اس کتاب کے تحقیقی معیار کا اندازہ مندرجہ ذیل مبصرین کی آراء سے ہو سکتا ہے۔

(۱) علامہ مجتبیٰ حسن صاحب قبلہ کاموں پوری ڈاکٹر آف جامع ازہر مصر، ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تحریر فرماتے ہیں۔

اگرچہ یہ کتاب متوسط التقطیع کے ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے لیکن مواد کے اعتبار سے کسی ضخیم کتاب سے کہیں زیادہ موثر ہے قوت استدلال اور زور تنقید کے لحاظ سے یہ مختصر کتاب اچھی کتابوں کی صف میں رکھی جائے گی۔"

(۲) ہفتہ وار شہاب لاہور بابت ۱۶ مئی ۱۹۶۲ء "اس رسالہ میں عباسی صاحب کی نکتہ آفرینیوں کا نہایت تحقیق سے جواب دیا گیا ہے" اس کتاب کی مقبولیت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کا اس مختصر مدت میں پہلا ایڈیشن ختم ہونے والا ہے۔

لہٰذا ارباب ذوق سے التماس ہے کہ وہ اس کتاب کو جلد از جلد حاصل کر لیں ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ قیمت صرف ۱۴ آنے

ملنے کا پتہ :- مکتبہ افکار اسلامی گاڑی کھاتہ حیدرآباد۔

شہابِ ثاقب

از سید حشمت حسین جعفری ایڈوکیٹ حیدرآباد (پاک)

ڈاکٹر احمد امین مصری مرحوم نے اپنی مشہور کتاب فجر الاسلام میں امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے مجموعہ کلام یعنی نہج البلاغہ پر تمام اعتراضات کو یکجا کر دیا ہے۔ موئف نے اس کتاب میں ان تمام اعتراضا پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد ثابت کیا ہے کہ یہ تمام اعتراضات غلط اور بے بنیاد ہیں اور نہج البلاغہ از ابتدا تا انتہا کلام جناب امیر علیہ السلام پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے متعلق چند مبصرین کی رائیں درج ذیل کی جاتی ہیں۔

(۱) ماہ نامہ فاران کراچی بابت ماہ مئی ۶۳ء

"جناب سید حشمت حسین جعفری نے ڈاکٹر صاحب موصوف کے اعتراضات کے جوابات بڑی قابلیت کے ساتھ دیئے ہیں اور یہ ثابت فرمایا ہے کہ "نہج البلاغہ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ ہی کا کلام اور بیان ہے"

(۲) علامہ سید مجتبیٰ احسن صاحب کاموں پوری ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کتاب شہاب ثاقب میں جناب سید حشمت حسین صاحب جعفری نے پروفیسر احمد امین کے جو جوابات دیئے ہیں ان سے فجر الاسلام سے پیدا شدہ شکوک کی جڑ کٹ جائیگی۔

طالبان حق سے عرض ہے کہ وہ اس کتاب کو جلد حاصل کرلیں تاکہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑے

قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ افکار اسلامی گاڑی کھاتہ حیدرآباد

عصمتِ رسولؐ

مولفہ: سید حشمت حسین جعفری ایڈوکیٹ حیدرآباد (پاک)

اس زمانہ میں جبکہ عیسائی تبلیغی مشن اپنی پوری قوت سے اسلام اور بانی اسلام کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈہ میں مصروف ہے۔ خود مسلمانوں میں یہ نظریہ عام ہو رہا ہے کہ حضور صلعم کی دو حیثیتیں تھیں ایک نبوی اور دوسری بشری نبوی حیثیت میں آپ ہر قسم کے گناہ اور ہر قسم کی خطا سے معصوم تھے لیکن بشری حیثیت میں آپ سے اجتہادی غلطیاں سرزد ہوتی تھیں جن پر بعض اوقات آپ پر منجانب خدا عتاب بھی ہوتا تھا۔ اس نظریہ کی تائید میں روایات کی روشنی میں بعض آیات قرآنی کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔

اس کتاب میں مولف نے اس غلط نظریہ کا تاریخی جائزہ لیکر بتلایا ہے کہ یہ کب اور کیونکر وجود میں آیا۔ نیز سلف صالحین کے اقوال کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ جن آیات سے لوگ آنحضرت صلعم کی عصمت کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں وہ آیات دراصل بمنزلہ زجاج نور ہیں جن سے مصباح عصمت مطلقہ کی کرنیں پھوٹ کر مومنین کے قلوب کو منور کرتی ہیں۔

اس کتاب کا ہر مسلمان کے گھر میں ہونا ضروری ہے۔

قیمت ۳ روپیہ

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ افکار اسلامی گاڑی کھاتہ حیدرآباد

شیعۂ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مؤلفہ: سید حشمت حسین جعفری ایڈوکیٹ حیدرآباد (پاک)

مؤلف نے یہ کتاب جذبۂ اتحاد بین المسلمین کے تحت لکھی ہے۔ انھوں نے اس میں اولاً یہ تبلایا ہے کہ قرآن مجید کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے۔ پھر اس پر اظہار افسوس کیا ہے کہ اتحاد کی اس قدر شدید تاکید کے باوجود مسلمان فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر مولف نے بتلایا ہے کہ عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ شیعہ ابن سبا یہودی کے چیلے ہیں اور اسطرح مسلمانوں کے دو گروہوں میں اختلافات کی خلیج وسیع کی جاتی ہے۔ در اصل قرآن میں مسلمان کا ہی دوسرا نام شیعہ ہے۔ ہر کلمہ گو اللہ کی نسبت سے مسلمان ہے اور رسول کی نسبت سے اس کا شیعہ ہے۔ اگر مسلمان خود کو شیعہ کہے تو اس سے کوئی فرقہ نہیں بنتا۔ پھر مؤلف نے اس طریقہ کار کی نشاندہی کی ہے جن پر عمل پیرا ہو کر مسلمان سلک اتحاد میں منسلک ہو سکتے ہیں۔

اس کتاب کی مقبولیت کا اس چیز سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قریب ایک سال کے اندر اندازاً اس کتاب کی دو تہائی جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔

شائقین حقائق سے گزارش ہے کہ وہ اس کتاب کو جلد از جلد حاصل کر لیں ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ قیمت۔ ایک روپیہ

ملنے کا پتہ:- مہتمم مکتبۂ افکار اسلامی گاڑی کھاتہ حیدرآباد